عَلَيْهَا ۚ وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ ۝

گا[1] اور جو شخص بے راہ رہے گا تو اس کا بے راہ ہونا اسی پر پڑے گا[2] اور میں تم پر مسلط نہیں کیا گیا۔[3] (۱۰۸)

وَاتَّبِعْ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ وَاصْبِرْ حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ۝

اور آپ اس کی اتباع کرتے رہیے جو کچھ آپ کے پاس وحی بھیجی جاتی ہے اور صبر کیجئے[4] یہاں تک کہ اللہ فیصلہ کر دے اور وہ سب فیصلہ کرنے والوں میں اچھا ہے۔[5] (۱۰۹)

سُوْرَةُ هُوْدٍ

سورۂ ہود مکی ہے اور اس کی ایک سو تیئس آیتیں اور دس رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

شروع کرتا ہوں میں اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان بڑا رحم والا ہے۔

---

(۱) یعنی اس کا فائدہ اسی کو ہو گا کہ قیامت والے دن اللہ کے عذاب سے بچ جائے گا۔

(۲) یعنی اس کا نقصان اور وبال اسی پر پڑے گا کہ قیامت کو جہنم کی آگ میں جلے گا۔ گویا کوئی ہدایت کا راستہ اپنائے گا' تو اس سے کوئی اللہ کی طاقت میں اضافہ نہیں ہو جائے گا اور اگر کوئی کفرو ضلالت کو اختیار کرے گا تو اس سے اللہ کی حکومت و طاقت میں کوئی فرق واقع نہیں ہو جائے گا۔ گویا ایمان و ہدایت کی ترغیب اور کفرو ضلالت سے بچنے کی تاکید و ترہیب' دونوں سے مقصد انسانوں ہی کی بھلائی اور خیر خواہی ہے۔ اللہ کی اپنی کوئی غرض نہیں ہے۔

(۳) یعنی یہ ذمہ داری مجھے نہیں سونپی گئی ہے کہ میں ہر صورت میں تمہیں مسلمان بنا کر چھوڑوں بلکہ میں تو صرف بشیر اور نذیر اور مبلغ اور داعی ہوں۔ میرا کام صرف اہل ایمان کو خوشخبری دینا' نافرمانوں کو اللہ کے عذاب اور اس کے مؤاخذے سے ڈرانا اور اللہ کے پیغام کی دعوت و تبلیغ ہے۔ کوئی اس دعوت کو مان کر ایمان لاتا ہے تو ٹھیک ہے' کوئی نہیں مانتا' تو میں اس بات کا مکلف نہیں ہوں کہ اس سے زبردستی منوا کر چھوڑوں۔

(۴) اللہ تعالیٰ جس چیز کی وحی کرے' اسے مضبوطی سے پکڑلیں' جس کا امر کرے' اسے عمل میں لائیں' جس سے روکے' رک جائیں اور کسی چیز میں کوتاہی نہ کریں۔ اور وحی کی اطاعت و اتباع میں جو تکلیفیں آئیں' مخالفین کی طرف سے جو ایذائیں پہنچیں اور تبلیغ و دعوت کی راہ میں جن دشواریوں سے گزرنا پڑے' ان پر صبر کریں اور ثابت قدمی سے سب کا مقابلہ کریں۔

(۵) کیونکہ اس کا علم بھی کامل ہے' اس کی قدرت و طاقت بھی وسیع ہے اور اس کی رحمت بھی عام ہے۔ اس لیے اس سے زیادہ بہتر فیصلہ کرنے والا اور کون ہو سکتا ہے؟

☆ اس سورت میں بھی ان قوموں کا تذکرہ ہے جو آیات الٰہی اور پیغمبروں کی تکذیب کرکے عذاب الٰہی کا نشانہ بنیں اور تاریخ کے صفحات سے یا تو حرف غلط کی طرح مٹ گئیں' یا اوراق تاریخ پر عبرت کا نمونہ بنی موجود ہیں۔ اسی لیے حدیث

الٓرٰ كِتٰبٌ اُحۡكِمَتۡ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتۡ مِنۡ لَّدُنۡ حَكِيۡمٍ خَبِيۡرٍۙ ﴿۱﴾

الر' یہ ایک ایسی کتاب ہے کہ اس کی آیتیں محکم کی گئی ہیں'(۱) پھر صاف صاف بیان کی گئی ہیں(۲) ایک حکیم باخبر کی طرف سے۔(۳) (۱)

اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّا اللّٰهَ ؕ اِنَّنِىۡ لَـكُمۡ مِّنۡهُ نَذِيۡرٌ وَّبَشِيۡرٌۙ ﴿۲﴾

یہ کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت مت کرو میں تم کو اللہ کی طرف سے ڈرانے والا اور بشارت دینے والا ہوں۔(۲)

وَّاَنِ اسۡتَغۡفِرُوۡا رَبَّكُمۡ ثُمَّ تُوۡبُوۡۤا اِلَيۡهِ يُمَتِّعۡكُمۡ مَّتَاعًا حَسَنًا اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى وَّيُؤۡتِ كُلَّ ذِىۡ فَضۡلٍ فَضۡلَهٗ ؕ وَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَاِنِّىۡۤ اَخَافُ عَلَيۡكُمۡ عَذَابَ يَوۡمٍ كَبِيۡرٍ ﴿۳﴾

اور یہ کہ تم لوگ اپنے گناہ اپنے رب سے معاف کراؤ پھر اسی کی طرف متوجہ رہو' وہ تم کو وقت مقرر تک اچھا سامان(۴) (زندگی) دے گا اور ہر زیادہ عمل کرنے والے کو زیادہ ثواب دے گا۔ اور اگر تم لوگ اعراض کرتے رہے تو مجھ کو تمہارے لیے ایک بڑے دن(۵) کے عذاب کا اندیشہ ہے۔(۳)

اِلَى اللّٰهِ مَرۡجِعُكُمۡ‌ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ ﴿۴﴾

تم کو اللہ ہی کے پاس جانا ہے اور وہ ہر شے پر پوری قدرت رکھتا ہے۔(۴)

میں آتا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ کیا بات ہے آپ بوڑھے سے نظر آتے ہیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "مجھے سورۂ ہود' واقعہ' عم یتساءلون اور إذا الشمس کورت وغیرہ نے بوڑھا کر دیا ہے"۔ (ترمذی۔ نمبر۳۲۹۷۔ صحیح ترمذی للألبانی ۳/ ۱۱۳)

(۱) یعنی الفاظ و نظم کے اعتبار سے اتنی محکم اور پختہ ہیں کہ ان کی ترکیب اور معنی میں کوئی خلل نہیں۔

(۲) پھر اس میں احکام و شرائع' مواعظ و قصص' عقائد و ایمانیات اور آداب و اخلاق جس طرح وضاحت اور تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں' پچھلی کتابوں میں اس کی نظیر نہیں آئی۔

(۳) یعنی اپنے اقوال میں حکیم ہے' اس لیے اس کی طرف سے نازل کردہ باتیں حکمت سے خالی نہیں اور وہ خبیر بھی ہے یعنی تمام معاملات اور ان کے انجام سے باخبر ہے۔ اس لیے اس کی باتوں پر عمل کرنے سے ہی انسان برے انجام سے بچ سکتا ہے۔

(۴) یہاں اس سامان دنیا کو جس کو قرآن نے عام طور پر "متاع غرور" دھوکے کا سامان۔ کہا ہے' یہاں اسے "متاع حسن" قرار دیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جو آخرت سے غافل ہو کر متاع دنیا سے استفادہ کرلے گا' اس کے لیے یہ متاع غرور ہے' کیونکہ اس کے بعد اسے برے انجام سے دوچار ہونا ہے اور جو آخرت کی تیاری کے ساتھ ساتھ اس سے فائدہ اٹھائے گا' اس کے لیے یہ چند روزہ سامان زندگی متاع حسن ہے' کیونکہ اس نے اسے اللہ کے احکام کے مطابق برتا ہے۔

(۵) بڑے دن سے مراد قیامت کا دن ہے۔

أَلَآ إِنَّهُمْ يَثْنُونَ صُدُورَهُمْ لِيَسْتَخْفُوا۟ مِنْهُ ۚ أَلَا حِينَ يَسْتَغْشُونَ ثِيَابَهُمْ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّونَ وَمَا يُعْلِنُونَ ۚ إِنَّهُۥ عَلِيمٌۢ بِذَاتِ ٱلصُّدُورِ ۝٥

یاد رکھو وہ لوگ اپنے سینوں کو دہرا کیے دیتے ہیں تاکہ اپنی باتیں (اللہ) سے چھپا سکیں۔[۱] یاد رکھو کہ وہ لوگ جس وقت اپنے کپڑے لپیٹتے ہیں وہ اس وقت بھی سب جانتا ہے جو کچھ چھپاتے ہیں اور جو کچھ وہ ظاہر کرتے ہیں۔ بالیقین وہ دلوں کے اندر کی باتیں جانتا ہے۔(۵)

---

(۱) اس کی شان نزول میں مفسرین کا اختلاف ہے' اس لیے اس کے مفہوم میں بھی اختلاف ہے۔ تاہم صحیح بخاری (تفسیر سورۂ ہود) میں بیان کردہ شان نزول سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ان مسلمانوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو غلبۂ حیا کی وجہ سے قضائے حاجت اور بیوی سے ہم بستری کے وقت برہنہ ہونا پسند نہیں کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں دیکھ رہا ہے' اس لیے ایسے موقعوں پر وہ شرم گاہ کو چھپانے کے لیے اپنے سینوں کو دہرا کر لیتے تھے۔ اللہ نے فرمایا کہ رات کو اندھیرے میں جب وہ بستروں میں اپنے آپ کو کپڑوں میں ڈھانپ لیتے تھے' تو اس وقت بھی وہ ان کو دیکھتا اور ان کی چھپی اور علانیہ باتوں کو جانتا ہے۔ مطلب یہ کہ شرم و حیا کا جذبہ اپنی جگہ بہت اچھا ہے لیکن اس میں اتنا غلو اور افراط بھی صحیح نہیں' اس لیے کہ جس ذات کی خاطر وہ ایسا کرتے ہیں اس سے تو پھر بھی وہ نہیں چھپ سکتے' تو پھر اس طرح کے تکلف کا کیا فائدہ؟

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا ؕ كُلٌّ فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۝

زمین پر چلنے پھرنے والے جتنے جاندار ہیں سب کی روزیاں اللہ تعالیٰ پر ہیں[1] وہی ان کے رہنے سہنے کی جگہ کو جانتا ہے اور ان کے سونپے جانے[2] کی جگہ کو بھی، سب کچھ واضح کتاب میں موجود ہے۔(۶)

وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ وَّكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ وَلَئِنْ قُلْتَ اِنَّكُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ مِنْ بَعْدِ الْمَوْتِ لَيَقُوْلَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝

اللہ ہی وہ ہے جس نے چھ دن میں آسمان و زمین کو پیدا کیا اور اس کا عرش پانی پر تھا[3] تاکہ وہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے اچھے عمل والا کون ہے،[4] اگر آپ ان سے کہیں کہ تم لوگ مرنے کے بعد اٹھا کھڑے کیے جاؤ گے تو کافر لوگ پلٹ کر جواب دیں گے کہ یہ تو نرا صاف صاف جادو ہی ہے۔(۷)

---

(۱) یعنی وہ کفیل اور ذمے دار ہے۔ زمین پر چلنے والی ہر مخلوق، انسان ہو یا جن، چرند ہو یا پرند، چھوٹی ہو یا بڑی، بحری ہو یا بری۔ ہر ایک کو اس کی نوعی یا جنسی ضروریات کے مطابق وہ خوراک مہیا کرتا ہے۔

(۲) مستقر اور مستودع کی تعریف میں اختلاف ہے۔ بعض کے نزدیک منتہائے سیر (یعنی زمین میں چل پھر کر جہاں رک جائے) مستقر ہے اور جس کو ٹھکانہ بنائے وہ مستودع ہے۔ بعض کے نزدیک رحم مادر مستقر اور باپ کی صلب مستودع ہے اور بعض کے نزدیک زندگی میں انسان یا حیوان جہاں رہائش پذیر ہو، وہ اس کا مستقر ہے اور جہاں مرنے کے بعد دفن ہو، وہ مستودع ہے۔ (تفسیر ابن کثیر) امام شوکانی کہتے ہیں، مستقر سے مراد رحم مادر اور مستودع سے وہ حصہ زمین ہے جس میں دفن ہو اور امام حاکم کی ایک روایت کی بنیاد پر اسی کو ترجیح دی ہے۔ بہرحال جو بھی مطلب لیا جائے، آیت کا مفہوم واضح ہے کہ چونکہ اللہ تعالیٰ کو ہر ایک کے مستقر و مستودع کا علم ہے، اس لیے وہ ہر ایک کو روزی پہنچانے پر قادر ہے اور ذمے دار ہے اور وہ اپنی ذمے داری پوری کرتا ہے۔

(۳) یہی بات صحیح احادیث میں بھی بیان کی گئی ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں آتا ہے کہ "اللہ تعالیٰ نے آسمان و زمین کی تخلیق سے پچاس ہزار سال قبل، مخلوقات کی تقدیر لکھی، اس وقت اس کا عرش پانی پر تھا"۔ (صحیح مسلم، کتاب القدر۔ نیز دیکھئے، صحیح بخاری، کتاب بدء الخلق)

(۴) یعنی یہ آسمان و زمین یوں ہی عبث اور بلا مقصد نہیں بنائے، بلکہ اس سے مقصود انسانوں (اور جنوں) کی آزمائش ہے کہ کون اچھے اعمال کرتا ہے؟

ملحوظہ: اللہ تعالیٰ نے یہاں یہ نہیں فرمایا کہ کون زیادہ عمل کرتا ہے بلکہ فرمایا کون زیادہ اچھے عمل کرتا ہے۔ اس لیے کہ اچھا عمل وہ ہوتا ہے جو صرف رضائے الٰہی کی خاطر ہو اور دوسرا یہ کہ وہ سنت کے مطابق ہو۔ ان دو شرطوں میں سے ایک شرط بھی فوت ہو جائے گی تو وہ اچھا عمل نہیں رہے گا، پھر وہ چاہے کتنا بھی زیادہ ہو، اللہ کے ہاں اس کی کوئی حیثیت نہیں۔

وَلَئِنْ اَخَّرْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ اِلٰٓى اُمَّةٍ مَّعْدُوْدَةٍ لَّيَقُوْلُنَّ مَا يَحْبِسُهٗ ۭ اَلَا يَوْمَ يَاْتِيْهِمْ لَيْسَ مَصْرُوْفًا عَنْهُمْ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝ ٨

اور اگر ہم ان سے عذاب کو گنی چنی مدت تک کے لیے پیچھے ڈال دیں تو یہ ضرور پکار اٹھیں گے کہ عذاب کو کون سی چیز روکے ہوئے ہے' سنو! جس دن وہ ان کے پاس آئے گا پھر ان سے ٹلنے والا نہیں پھر تو جس چیز کی ہنسی اڑا رہے تھے وہ انہیں گھیر لے گی۔[1] (۸)

وَلَئِنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنٰهَا مِنْهُ ۚ اِنَّهٗ لَيَـــُٔوْسٌ كَفُوْرٌ ۝ ٩

اگر ہم انسان کو اپنی کسی نعمت کا ذائقہ چکھا کر پھر اسے اس سے لے لیں تو وہ بہت ہی ناامید اور بڑا ہی ناشکرا بن جاتا ہے۔[2] (۹)

وَلَئِنْ اَذَقْنٰهُ نَعْمَاۗءَ بَعْدَ ضَرَّاۗءَ مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ ذَهَبَ السَّيِّاٰتُ عَنِّيْ ۭ اِنَّهٗ لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ ۝ ١٠

اور اگر ہم اسے کوئی نعمت چکھائیں اس سختی کے بعد جو اسے پہنچ چکی تھی تو وہ کہنے لگتا ہے کہ بس برائیاں مجھ سے جاتی رہیں'[3] یقیناً وہ بڑا ہی اترانے والا شیخی خور ہے۔[4] (۱۰)

---

(۱) یہاں استعجال (جلد طلب کرنے) کو 'استہزا سے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ وہ استعجال 'بطور استہزا ہی ہوتا تھا۔ بہر حال مقصود یہ سمجھانا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تاخیر پر انسان کو غفلت میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے 'اس کی گرفت کسی بھی وقت ہو سکتی ہے۔

(۲) انسانوں میں عام طور پر جو مذموم صفات پائی جاتی ہیں اس میں اور اگلی آیت میں ان کا بیان ہے۔ ناامیدی کا تعلق مستقبل سے ہے اور ناشکری کا ماضی و حال سے۔

(۳) یعنی سمجھتا ہے کہ سختیوں کا دور گزر گیا ہے 'اب اسے کوئی تکلیف نہیں آئے گی۔

اُمَّةٌ کے مختلف مفہوم: آیت نمبر ۸ میں اُمَّةٍ کا لفظ آیا ہے۔ یہ قرآن مجید میں مختلف مقامات پر مختلف مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ یہ ام سے مشتق ہے' جس کے معنی قصد کے ہیں۔ یہاں اس کے معنی اس وقت اور مدت کے ہیں جو نزول عذاب کے لیے مقصود ہے' (فتح القدیر) سورۂ یوسف کی آیت ۴۵ ﴿وَادَّكَرَ بَعْدَ اُمَّةٍ﴾ میں بھی یہی مفہوم ہے اس کے علاوہ جن معنوں میں اس کا استعمال ہوا ہے' ان میں ایک امام و پیشوا ہے۔ جیسے ﴿اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً﴾ (النحل' ۱۲۰) ملت اور دین ہے' جیسے ﴿اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَاۗءَنَا عَلٰٓي اُمَّةٍ﴾ (الزخرف' ۲۳) جماعت اور طائفہ ہے' جیسے ﴿وَلَمَّا وَرَدَ مَاۗءَ مَدْيَنَ وَجَدَ عَلَيْهِ اُمَّةً مِّنَ النَّاسِ﴾ (القصص' ۲۳) ﴿وَمِنْ قَوْمِ مُوْسٰٓى اُمَّةٌ﴾ (الأعراف' ۱۵۹) وغیرہا۔ وہ مخصوص گروہ' یا قوم ہے' جس کی طرف کوئی رسول مبعوث ہو۔ ﴿وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ﴾ (یونس' ۴۷) اس کو امت دعوت بھی کہتے ہیں۔ اور اسی طرح پیغمبر پر ایمان لانے والوں کو بھی امت یا امت اتباع یا امت اجابت کہا جاتا ہے۔ (ابن کثیر)

(۴) یعنی جو کچھ اس کے پاس ہے' اس پر اتراتا اور دوسروں پر فخر و غرور کا اظہار کرتا ہے۔ تاہم ان صفات مذمومہ سے اہل ایمان اور صاحب اعمال صالحہ مستثنیٰ ہیں جیسا کہ اگلی آیت سے واضح ہے۔

إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا وَعَمِلُوا الصَّلِحَتِ أُولَٰئِكَ لَهُم مَّغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ كَبِيرٌ ﴿١١﴾

سوائے ان کے جو صبر کرتے ہیں اور نیک کاموں میں لگے رہتے ہیں۔ انہی لوگوں کے لیے بخشش بھی ہے اور بہت بڑا نیک[1] بدلہ بھی۔(۱۱)

فَلَعَلَّكَ تَارِكٌ بَعْضَ مَا يُوحَىٰ إِلَيْكَ وَضَائِقٌ بِهِ صَدْرُكَ أَن يَقُولُوا لَوْلَا أُنزِلَ عَلَيْهِ كَنزٌ أَوْ جَاءَ مَعَهُ مَلَكٌ إِنَّمَا أَنتَ نَذِيرٌ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ وَكِيلٌ ﴿١٢﴾

پس شاید کہ آپ اس وحی کے کسی حصے کو چھوڑ دینے والے ہیں جو آپ کی طرف نازل کی جاتی ہے اور اس سے آپ کا دل تنگ ہے' صرف ان کی اس بات پر کہ اس پر کوئی خزانہ کیوں نہیں اترا؟ یا اس کے ساتھ کوئی فرشتہ ہی آتا' سن لیجئے! آپ تو صرف ڈرانے والے ہی ہیں[2] اور ہر چیز کا ذمہ دار اللہ تعالیٰ ہے۔(۱۲)

أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ قُلْ فَأْتُوا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهِ مُفْتَرَيَاتٍ وَادْعُوا مَنِ اسْتَطَعْتُم مِّن دُونِ اللَّهِ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ﴿١٣﴾

کیا یہ کہتے ہیں کہ اس قرآن کو اسی نے گھڑا ہے۔ جواب دیجئے کہ پھر تم بھی اسی کے مثل دس سورتیں گھڑی ہوئی لے آؤ اور اللہ کے سوا جسے چاہو اپنے ساتھ بلا بھی لو اگر تم سچے ہو۔[3] (۱۳)

---

(۱) یعنی اہل ایمان' راحت و فراغت ہو یا تنگی اور مصیبت' دونوں حالتوں میں اللہ کے احکام کے مطابق طرز عمل اختیار کرتے ہیں۔ جیسا کہ حدیث میں آتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قسم کھا کر فرمایا "قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے' اللہ تعالیٰ مومن کے لیے جو بھی فیصلہ فرماتا ہے' اس میں اس کے لیے بہتری کا پہلو ہوتا ہے۔ اگر اس کو راحت پہنچتی ہے تو اس پر اللہ کا شکر کرتا ہے' جو اس کے لیے بہتر (یعنی اجر کا باعث) ہے اور اگر کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو صبر کرتا ہے' یہ بھی اس کے لیے بہتر (یعنی اجر و ثواب کا باعث) ہے یہ امتیاز ایک مومن کے سوا کسی کو حاصل نہیں"۔ (صحیح مسلم' کتاب الزهد' باب المؤمن أمره كله خير) اور ایک اور حدیث میں فرمایا کہ "مومن کو جو بھی فکر و غم اور تکلیف پہنچتی ہے حتیٰ کہ اسے کانٹا چبھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی وجہ سے اس کی غلطیاں معاف فرما دیتا ہے"۔ (مسند أحمد' جلد ۳' ص ۴) سورۂ معارج کی آیات ۱۹' ۲۲ میں بھی یہ مضمون بیان کیا گیا ہے۔

(۲) مشرکین نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بابت کہتے رہتے تھے کہ اس کے ساتھ کوئی فرشتہ کیوں نازل نہیں ہوتا' یا اس کی طرف کوئی خزانہ کیوں نہیں اتار دیا جاتا۔ (الفرقان-۸) ایک دوسرے مقام پر فرمایا گیا "ہمیں معلوم ہے کہ یہ لوگ آپ کی بابت جو باتیں کہتے ہیں' ان سے آپ کا سینہ تنگ ہوتا ہے" (سورۃ الحجر-۹۸) اس آیت میں انہی باتوں کے حوالے سے کہا جا رہا ہے کہ شاید آپ کا سینہ تنگ ہو اور کچھ باتیں جو آپ کی طرف وحی کی جاتی ہیں اور وہ مشرکین پر گراں گزرتی ہیں' ممکن ہے آپ وہ انہیں سنانا پسند نہ کریں۔ آپ کا کام صرف انذار و تبلیغ ہے' وہ آپ ہر صورت میں کیے جائیں۔

(۳) امام ابن کثیر لکھتے ہیں کہ پہلے اللہ تعالیٰ نے چیلنج دیا کہ اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو کہ یہ محمد (صلی اللہ علیہ

فَاِلَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ وَاَنْ لَّآ اِلٰهَ
اِلَّا هُوَ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۴﴾

پھر اگر وہ تمہاری اس بات کو قبول نہ کریں تو تم یقین سے جان لو کہ یہ قرآن اللہ کے علم کے ساتھ اتارا گیا ہے اور یہ کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، پس کیا تم مسلمان ہوتے ہو؟[1] (۱۴)

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ
فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ ﴿۱۵﴾

جو شخص دنیا کی زندگی اور اس کی زینت پر فریفتہ ہوا چاہتا ہو ہم ایسوں کو ان کے کل اعمال (کا بدلہ) یہیں بھرپور پہنچا دیتے ہیں اور یہاں انہیں کوئی کمی نہیں کی جاتی۔(۱۵)

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ ۖ وَحَبِطَ مَا
صَنَعُوْا فِيْهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶﴾

ہاں یہی وہ لوگ ہیں جن کے لیے آخرت میں سوائے آگ کے اور کچھ نہیں اور جو کچھ انہوں نے یہاں کیا ہوگا وہاں سب اکارت ہے اور جو کچھ ان کے اعمال تھے سب برباد ہونے والے ہیں۔[2] (۱۶)

وسلم) کا بنایا ہوا قرآن ہے، تو اس کی نظیر پیش کر کے دکھلا دو، اور تم جس کی چاہو، مدد حاصل کر لو، لیکن تم کبھی ایسا نہیں کر سکو گے۔ فرمایا ﴿ قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ﴾ (بنی إسرائیل-۸۸) "اعلان کر دیجئے! کہ اگر تمام انسان اور کل جنات مل کر اس قرآن کے مثل لانا چاہیں، تو ان سب سے اس کے مثل لانا مشکل ہے، گو وہ آپس میں ایک دوسرے کے مددگار بھی بن جائیں"۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ چیلنج دیا کہ پورا قرآن بنا کر پیش نہیں کر سکتے تو دس سورتیں ہی بنا کر پیش کر دو۔ جیسا کہ اس مقام پر ہے۔ پھر تیسرے نمبر پر چیلنج دیا کہ چلو ایک سورت بنا کر پیش کر دو جیسا کہ سورۂ یونس کی آیت ۳۹ اور سورۂ بقرہ کے آغاز میں فرمایا (تفسیر ابن کثیر، زیر بحث آیت سورۂ یونس) اور اس بناء پر آخری چیلنج یہ ہو سکتا ہے کہ اس جیسی ایک بات ہی بنا کر پیش کر دو۔ ﴿ فَلْيَاْتُوْا بِحَدِيْثٍ مِّثْلِهٖٓ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ ﴾ (الطور-۳۴) مگر ترتیب نزول سے چیلنج کی اس ترتیب کی تائید نہیں ہوتی۔ وَاللّٰهُ أَعْلَمُ بِالصَّوَابِ.

(۱) یعنی کیا اس کے بعد بھی کہ تم اس چیلنج کا جواب دینے سے قاصر ہو، یہ ماننے کے لیے، کہ یہ قرآن اللہ ہی کا نازل کردہ ہے، آمادہ نہیں ہو اور نہ مسلمان ہونے کے لیے تیار ہو؟

(۲) ان دو آیات کے بارے میں بعض کا خیال ہے کہ اس میں اہل ریا کا ذکر ہے، بعض کے نزدیک اس سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں اور بعض کے نزدیک اس میں طالبان دنیا کا ذکر ہے۔ کیونکہ دنیا دار بھی جو بعض اچھے عمل کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کی جزا انہیں دنیا میں دے دیتا ہے، آخرت میں ان کے لیے سوائے عذاب کے اور کچھ نہیں ہو گا۔ اسی مضمون کو قرآن مجید میں سورۂ بنی إسرائیل، آیات ۱۸، ۲۱ اور سورۂ شوریٰ، آیت ۲۰ میں بیان کیا گیا ہے۔

أَفَمَن كَانَ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّهِ وَيَتْلُوهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ وَمِن قَبْلِهِ كِتَابُ مُوسَىٰ إِمَامًا وَرَحْمَةً ۚ أُولَٰئِكَ يُؤْمِنُونَ بِهِ ۚ وَمَن يَكْفُرْ بِهِ مِنَ الْأَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهُ ۚ فَلَا تَكُ فِي مِرْيَةٍ مِّنْهُ ۚ إِنَّهُ الْحَقُّ مِن رَّبِّكَ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿۱۷﴾

کیا وہ شخص جو اپنے رب کے پاس کی دلیل پر ہو اور اس کے ساتھ اللہ کی طرف کا گواہ ہو اور اس سے پہلے موسیٰ کی کتاب (گواہ ہو) جو پیشوا اور رحمت ہے (اوروں کے برابر ہو سکتا ہے؟)۔[۱] یہی لوگ ہیں جو اس پر ایمان رکھتے ہیں،[۲] اور تمام فرقوں میں سے جو بھی اس کا منکر ہو اس کے آخری وعدے کی جگہ جہنم[۳] ہے، پس تو اس میں کسی قسم کے شبہ میں نہ رہ، یقیناً یہ تیرے رب کی جانب سے سراسر برحق ہے، لیکن اکثر لوگ ایمان لانے والے

---

(۱) منکرین اور کافرین کے مقابلے میں اہل فطرت اور اہل ایمان کا تذکرہ کیا جا رہا ہے۔ "اپنے رب کی طرف سے دلیل" سے مراد، وہ فطرت ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو پیدا فرمایا ہے اور وہ ہے اللہ واحد کا اعتراف اور اسی کی عبادت۔ جس طرح کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ "ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے، پس اس کے بعد اس کے ماں باپ اسے یہودی، نصرانی، یا مجوسی بنا دیتے ہیں....." (صحیح بخاری۔ کتاب الجنائز و مسلم، کتاب القدر) يَتْلُوهُ کے معنی ہیں، اس کے پیچھے۔ یعنی اس کے ساتھ اللہ کی طرف سے ایک گواہ بھی ہو، گواہ سے مراد قرآن، یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، جو اس فطرت صحیحہ کی طرف دعوت دیتے اور اس کی نشاندہی کرتے ہیں۔ اور اس سے پہلے موسیٰ علیہ السلام کی کتاب تورات بھی جو پیشوا بھی ہے اور رحمت کا سبب بھی ہے۔ یعنی یہ کتاب موسیٰ علیہ السلام بھی قرآن پر ایمان لانے کی طرف رہنمائی کرنے والی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایک وہ شخص ہے جو منکر و کافر ہے اور اس کے مقابلے میں ایک دوسرا شخص ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے دلیل پر قائم ہے، اس پر ایک گواہ (قرآن، یا پیغمبر اسلام ﷺ) بھی ہے، اسی طرح اس سے قبل نازل ہونے والی کتاب، تورات، میں بھی اس کے لیے پیشوائی کا اہتمام کیا گیا ہے۔ اور وہ ایمان لے آتا ہے کیا یہ دونوں شخص برابر ہو سکتے ہیں؟ یعنی یہ دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ ایک مومن ہے اور دوسرا کافر۔ ایک ہر طرح کے دلائل سے لیس ہے دوسرا بالکل خالی ہے۔

(۲) یعنی جن کے اندر مذکورہ اوصاف پائے جائیں گے وہ قرآن کریم اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائیں گے۔

(۳) تمام فرقوں سے مراد، روئے زمین پر پائے جانے والے مذاہب ہیں، یہودی، عیسائی، زرتشتی، بدھ مت، مجوسی اور مشرکین و کفار وغیرہم، جو بھی حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہیں لائے گا، اس کا ٹھکانا جہنم ہے۔ یہ وہی مضمون ہے جسے اس حدیث میں بیان کیا گیا ہے "قسم ہے، اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، اس امت کے جس یہودی، یا عیسائی نے بھی میری نبوت کی بابت سنا اور پھر مجھ پر ایمان نہیں لایا، وہ جہنم میں جائے گا"۔ (صحیح مسلم، كتاب الإيمان، باب وجوب الإيمان برسالة نبينا محمد صلى الله عليه وسلم إلى جميع الناس) یہ مضمون اس سے قبل سورۂ بقرہ، آیت ۶۲ اور سورۂ نساء آیت ۱۵۰، ۱۵۲ میں بھی گزر چکا ہے۔

نہیں ہوتے۔ [۱] (۱۷)

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ۭ اُولٰۗىِٕكَ يُعْرَضُوْنَ عَلٰي رَبِّهِمْ وَيَقُوْلُ الْاَشْهَادُ هٰٓؤُلَاۗءِ الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلٰي رَبِّهِمْ ۚ اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَي الظّٰلِمِيْنَ ۝

اس سے بڑھ کر ظالم کون ہو گا جو اللہ پر جھوٹ باندھے [۲] یہ لوگ اپنے پروردگار کے سامنے پیش کیے جائیں گے اور سارے گواہ کہیں گے کہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے پروردگار پر جھوٹ باندھا' خبردار ہو کہ اللہ کی لعنت ہے ظالموں پر۔ [۳] (۱۸)

الَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۭ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ۝

جو اللہ کی راہ سے روکتے ہیں اور اس میں کجی تلاش کر لیتے ہیں۔ [۴] یہی آخرت کے منکر ہیں۔ (۱۹)

اُولٰۗىِٕكَ لَمْ يَكُوْنُوْا مُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ وَمَا كَانَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَاۗءَ ۘ يُضٰعَفُ لَهُمُ الْعَذَابُ ۭ مَا كَانُوْا يَسْتَطِيْعُوْنَ السَّمْعَ وَمَا كَانُوْا يُبْصِرُوْنَ ۝

نہ یہ لوگ دنیا میں اللہ کو ہرا سکے اور نہ ان کا کوئی حمایتی اللہ کے سوا ہوا' ان کے لیے عذاب دگنا کیا جائے گا نہ یہ سننے کی طاقت رکھتے تھے اور نہ یہ دیکھتے ہی تھے۔ [۵] (۲۰)

---

(۱) یہ وہی مضمون ہے جو قرآن مجید کے مختلف مقامات پر بیان کیا گیا ہے۔ ﴿ وَمَآ اَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴾ —— (سورۂ یوسف۔۱۰۳) "تیری خواہش کے باوجود اکثر لوگ ایمان نہیں لائیں گے"۔ ﴿وَلَقَدْ صَدَّقَ عَلَيْهِمْ اِبْلِيْسُ ظَنَّهٗ فَاتَّبَعُوْهُ اِلَّا فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ (سورۃ سبا۔۲۰) "ابلیس نے اپنا گمان سچا کر دکھایا' مومنوں کے ایک گروہ کے سوا' سب اس کے پیروکار بن گئے"۔

(۲) یعنی جن کو اللہ نے کائنات میں تصرف کرنے کا یا آخرت میں شفاعت کا اختیار نہیں دیا ہے' ان کی بابت یہ کہا جائے کہ اللہ نے انہیں یہ اختیار دیا ہے۔

(۳) حدیث میں اس کی تفسیر اس طرح آتی ہے کہ "قیامت والے دن اللہ تعالیٰ ایک مومن سے اس کے گناہوں کا اقرار و اعتراف کروائے گا کہ تجھے معلوم ہے کہ تو نے فلاں گناہ بھی کیا تھا' فلاں بھی کیا تھا' وہ مومن کہے گا کہ ہاں ٹھیک ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا' میں نے ان گناہوں پر دنیا میں بھی پردہ ڈالے رکھا تھا' جا آج بھی انہیں معاف کرتا ہوں۔ لیکن دوسرے لوگ یا کافروں کا معاملہ ایسا ہو گا کہ انہیں گواہوں کے سامنے پکارا جائے گا اور گواہ یہ گواہی دیں گے کہ یہی وہ لوگ ہیں' جنہوں نے اپنے رب پر جھوٹ باندھا تھا"۔ (صحیح بخاری۔ تفسیر سورۃ ھود)

(۴) یعنی لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکنے کے لیے' اس میں کجیاں تلاش کرتے اور لوگوں کو اس سے متنفر کرتے ہیں۔

(۵) یعنی ان کا حق سے اعراض اور بغض اس انتہا پر پہنچا ہوا تھا کہ یہ اسے سننے اور دیکھنے کی طاقت ہی نہیں رکھتے تھے۔ یا یہ مطلب ہے کہ اللہ نے ان کو کان اور آنکھیں تو دی تھیں لیکن انہوں نے ان سے حق کی بات نہ سنی اور نہ دیکھی۔ گویا ﴿ فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَآ اَبْصَارُهُمْ وَلَآ اَفْــِٕدَتُهُمْ مِّنْ شَيْءٍ ﴾ (سورۃ الأحقاف۔۲۶) "نہ ان کے کانوں نے انہیں کوئی فائدہ پہنچایا' نہ ان کی آنکھوں اور دلوں نے" کیونکہ وہ حق کے سننے سے بہرے اور حق کے دیکھنے سے اندھے بنے رہے'

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُم مَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ ﴿۲۱﴾

یہی ہیں جنہوں نے اپنا نقصان آپ کر لیا اور وہ سب کچھ ان سے کھو گیا' جو انہوں نے گھڑ رکھا تھا۔(۲۱)

لَا جَرَمَ أَنَّهُمْ فِي الْآخِرَةِ هُمُ الْأَخْسَرُونَ ﴿۲۲﴾

بیشک یہی لوگ آخرت میں زیاں کار ہوں گے۔(۲۲)

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَأَخْبَتُوا إِلَىٰ رَبِّهِمْ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿۲۳﴾

یقیناً جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے کام بھی نیک کیے اور اپنے پالنے والے کی طرف جھکتے رہے' وہی جنت میں جانے والے ہیں' جہاں وہ ہمیشہ ہی رہنے والے ہیں۔(۲۳)

مَثَلُ الْفَرِيقَيْنِ كَالْأَعْمَىٰ وَالْأَصَمِّ وَالْبَصِيرِ وَالسَّمِيعِ ۚ هَلْ يَسْتَوِيَانِ مَثَلًا ۚ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ﴿۲۴﴾

ان دونوں فرقوں کی مثال اندھے' بہرے اور دیکھنے' سننے والے جیسی ہے۔ (۱)کیا یہ دونوں مثال میں برابر ہیں؟ کیا پھر بھی تم نصیحت حاصل نہیں کرتے؟(۲۴)

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِ إِنِّي لَكُمْ نَذِيرٌ مُّبِينٌ ﴿۲۵﴾

یقیناً ہم نے نوح (علیہ السلام) کو اس کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا کہ میں تمہیں صاف صاف ہوشیار کر دینے والا ہوں۔(۲۵)

أَن لَّا تَعْبُدُوا إِلَّا اللَّهَ ۖ إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ

کہ تم صرف اللہ ہی کی عبادت کرو' (۲) مجھے تو تم پر

جس طرح کہ وہ جہنم میں داخل ہوتے ہوئے کہیں گے' ﴿لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ أَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِي أَصْحَابِ السَّعِيرِ﴾ (الملک۔۱۰) "اگر ہم سنتے اور عقل سے کام لیتے تو آج جہنم میں نہ جاتے"۔

(۱) پچھلی آیات میں مومنین اور کافرین اور سعادت مندوں اور بد بختوں' دونوں کا تذکرہ فرمایا۔ اب اس میں دونوں کی مثال بیان فرما کر دونوں کی حقیقت کو مزید واضح کیا جا رہا ہے۔ فرمایا' ایک کی مثال اندھے اور بہرے کی طرح ہے اور دوسرے کی مثال دیکھنے اور سننے والے کی طرح۔ کافر دنیا میں حق کا روئے زیبا دیکھنے سے محروم اور آخرت میں نجات کے راستے سے بے بہرہ' اسی طرح حق کے دلائل سننے سے بے بہرہ ہوتا ہے' اسی لیے ایسی باتوں سے محروم رہتا ہے جو اس کے لیے مفید ہوں۔ اس کے برعکس مومن سمجھ دار' حق کو دیکھنے والا اور حق و باطل کے درمیان تمیز کرنے والا ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ حق اور خیر کی پیروی کرتا ہے' دلائل کو سنتا اور ان کے ذریعے سے شبہات کا ازالہ کرتا اور باطل سے اجتناب کرتا ہے۔ کیا یہ دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ استفہام نفی کے لئے ہے۔ یعنی دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔ جیسے دوسرے مقام پر فرمایا۔ ﴿لَا يَسْتَوِي أَصْحَابُ النَّارِ وَأَصْحَابُ الْجَنَّةِ ۚ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ هُمُ الْفَائِزُونَ﴾ (سورۃ الحشر۔۲۰) "جنتی دوزخی برابر نہیں ہو سکتے۔ جنتی تو کامیاب ہونے والے ہیں" ایک اور مقام پر اسے اس طرح بیان فرمایا "اندھا اور دیکھنے والا برابر نہیں۔ اندھیرے اور روشنی' سایہ اور دھوپ برابر نہیں' زندے اور مردے برابر نہیں"۔ (سورۃ فاطر۔۱۹'۲۰)

(۲) یہ وہی دعوت توحید ہے جو ہر نبی نے آکر اپنی اپنی قوم کو دی۔ جس طرح فرمایا ﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ مِن رَّسُولٍ إِلَّا

اَلِيْمٍ ﴿٢٦﴾

فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ ۚ وَمَا نَرٰى لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍۭ بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِيْنَ ﴿٢٧﴾

دردناک دن کے عذاب کا خوف[1] ہے۔(۲۶)

اس کی قوم کے کافروں کے سرداروں نے جواب دیا کہ ہم تو تجھے اپنے جیسا انسان ہی دیکھتے ہیں[2] اور تیرے تابعداروں کو بھی ہم دیکھتے ہیں کہ یہ لوگ واضح طور پر سوائے نیچ[3] لوگوں کے[4] اور کوئی نہیں جو بے سوچے سمجھے (تمہاری پیروی کر رہے ہیں)، ہم تو تمہاری کسی قسم کی برتری اپنے اوپر نہیں دیکھ رہے، بلکہ ہم تو تمہیں جھوٹا سمجھ رہے ہیں۔(۲۷)

نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ﴾ (الأنبياء-٢٥) "جو پیغمبر ہم نے آپ سے پہلے بھیجے، ان کی طرف یہی وحی کی کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں، پس میری ہی عبادت کرو"۔

(۱) یعنی اگر مجھ پر ایمان نہیں لائے اور اس دعوت توحید کو نہیں اپنایا تو عذاب الٰہی سے نہیں بچ سکو گے۔

(۲) یہ وہی شبہ ہے، جس کی پہلے کئی جگہ وضاحت کی جا چکی ہے کہ کافروں کے نزدیک بشریت کے ساتھ نبوت و رسالت کا اجتماع بڑا عجیب تھا، جس طرح آج کے اہل بدعت کو بھی عجیب لگتا ہے اور وہ بشریت رسول ﷺ سے انکار کرتے ہیں۔

(۳) حق کی تاریخ میں یہ بات بھی ہر دور میں سامنے آتی رہی ہے کہ ابتداء میں اس کو اپنانے والے ہمیشہ وہ لوگ ہوتے جنہیں معاشرے میں بے نوا اور کم تر سمجھا جاتا تھا اور صاحب حیثیت اور خوش حال طبقہ اس سے محروم رہتا۔ حتیٰ کہ یہ چیز پیغمبروں کے پیروکاروں کی علامت بن گئی۔ چنانچہ جب شاہ روم ہرقل نے حضرت ابو سفیان رضی اللہ عنہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بابت باتیں پوچھیں تو اس میں ان سے ایک بات یہ بھی پوچھی کہ "اس کے پیروکار معاشرے کے معزز سمجھے جانے والے لوگ ہیں یا کمزور لوگ؟" تو حضرت ابو سفیان رضی اللہ عنہ نے جواب میں کہا "کمزور لوگ"۔ جس پر ہرقل نے کہا "رسولوں کے پیروکار یہی لوگ ہوتے ہیں" (صحیح بخاری حدیث نمبر-۷) قرآن کریم میں بھی وضاحت کی گئی ہے کہ خوش حال طبقہ ہی سب سے پہلے پیغمبروں کی تکذیب کرتا رہا ہے۔ (سورۂ زخرف-۲۳) اور یہ اہل ایمان کی دنیوی حیثیت تھی اور جس کے اعتبار سے اہل کفر انہیں حقیر اور کم تر سمجھتے تھے، ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ حق کے پیروکار معزز اور اشراف ہیں چاہے وہ مال و دولت کے اعتبار سے فروتر ہی ہوں اور حق کا انکار کرنے والے حقیر اور بے حیثیت ہیں چاہے وہ دنیوی اعتبار سے مال دار ہی ہوں۔

(۴) اہل ایمان چونکہ، اللہ اور رسول کے احکام کے مقابلے میں اپنی عقل و دانش اور رائے کا استعمال نہیں کرتے، اس لیے اہل باطل یہ سمجھتے ہیں کہ یہ بے سوچ سمجھ والے ہیں کہ اللہ کا رسول انہیں جس طرف موڑ دیتا ہے، یہ مڑ جاتے ہیں جس چیز سے روک دیتا ہے، رک جاتے ہیں۔ یہ بھی اہل ایمان کی ایک بڑی خوبی بلکہ ایمان کا لازمی تقاضا ہے۔ لیکن اہل کفر و باطل کے نزدیک یہ خوبی بھی "عیب" ہے۔

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَاٰتٰىنِيْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ فَعُمِّيَتْ عَلَيْكُمْ اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَاَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ ﴿۲۸﴾

نوح نے کہا' میری قوم والو! مجھے بتاؤ تو اگر میں اپنے رب کی طرف سے کسی دلیل پر ہوا اور مجھے اس نے اپنے پاس کی کوئی رحمت عطا کی ہو' [۱] پھر وہ تمہاری نگاہوں میں [۲] نہ آئی تو کیا زبردستی میں اسے تمہارے گلے منڈھ دوں' حالانکہ تم اس سے بیزار ہو۔ [۳] (۲۸)

وَيٰقَوْمِ لَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مَالًا ؕ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ وَمَاۤ اَنَا بِطَارِدِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ اِنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَلٰكِنِّيْۤ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ ﴿۲۹﴾

میری قوم والو! میں تم سے اس پر کوئی مال نہیں مانگتا۔ [۴] میرا ثواب تو صرف اللہ تعالیٰ کے ہاں ہے نہ میں ایمان والوں کو اپنے پاس سے نکال سکتا ہوں' [۵] انہیں اپنے رب سے ملنا ہے لیکن میں دیکھتا ہوں کہ تم لوگ جہالت کر رہے ہو۔ [۶] (۲۹)

وَيٰقَوْمِ مَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ طَرَدْتُّهُمْ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۳۰﴾

میری قوم کے لوگو! اگر میں ان مومنوں کو اپنے پاس سے نکال دوں تو اللہ کے مقابلہ میں میری مدد کون کر سکتا

---

(۱) بَيِّنَةٍ سے مراد ایمان ویقین ہے اور رحمت سے مراد نبوت۔ جس سے اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو سرفراز کیا تھا۔

(۲) یعنی تم اس کے دیکھنے سے اندھے ہو گئے۔ چنانچہ تم نے نہ اس کی قدر پہچانی اور نہ اسے اپنانے پر آمادہ ہوئے' بلکہ اس کی تکذیب اور رد کے درپے ہو گئے۔

(۳) جب یہ بات ہے تو یہ ہدایت و رحمت تمہارے حصے میں کس طرح آ سکتی ہے؟

(۴) تاکہ تمہارے دماغوں میں یہ شبہ نہ آ جائے کہ اس دعوائے نبوت سے اس کا مقصد تو دولت دنیا اکٹھا کرنا ہے۔ میں تو یہ کام صرف اللہ کے حکم پر اور اسی کی رضا کے لیے کر رہا ہوں' وہی مجھے اس کا اجر بھی دے گا۔

(۵) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قوم نوح علیہ السلام کے سرداروں نے بھی معاشرے میں کمزور سمجھے جانے والے اہل ایمان کو حضرت نوح علیہ السلام سے اپنی مجلس یا اپنے قرب سے دور رکھنے کا مطالبہ کیا ہوگا' جس طرح رؤسائے مکہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس قسم کا مطالبہ کیا تھا' جس پر اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی یہ آیات نازل فرمائیں تھیں ﴿وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ﴾ (سورة الأنعام-۵۲) "اے پیغمبر! ان لوگوں کو اپنے سے دور مت کرنا جو صبح و شام اپنے رب کو پکارتے ہیں"۔ ﴿وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ﴾ —— (الكهف-۲۸) اپنے نفسوں کو ان لوگوں کے ساتھ جوڑے رکھیے! جو اپنے رب کو صبح و شام پکارتے ہیں' اپنے رب کی رضا چاہتے ہیں' آپ کی آنکھیں ان سے گزر کر کسی اور کی طرف تجاوز نہ کریں"۔

(۶) یعنی اللہ اور رسول کے پیروکاروں کو حقیر سمجھنا اور پھر انہیں قرب نبوت سے دور کرنے کا مطالبہ کرنا' یہ تمہاری جہالت ہے۔ یہ لوگ تو اس لائق ہیں کہ انہیں سر آنکھوں پر بٹھایا جائے نہ کہ دور دھتکارا جائے۔

ہے؟[۱] کیا تم کچھ بھی نصیحت نہیں پکڑتے۔(۳۰)

وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآىِٕنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ اِنِّيْ مَلَكٌ وَّلَآ اَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ تَزْدَرِيْٓ اَعْيُنُكُمْ لَنْ يُّؤْتِيَهُمُ اللّٰهُ خَيْرًا ۭ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ ښ اِنِّىْٓ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝۳۱

میں تم سے نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں' (سنو!) میں غیب کا علم بھی نہیں رکھتا' نہ میں یہ کہتا ہوں کہ میں کوئی فرشتہ ہوں' نہ میرا یہ قول ہے کہ جن پر تمہاری نگاہیں ذلت سے پڑ رہی ہیں انہیں اللہ تعالیٰ کوئی نعمت دے گا ہی نہیں'[۲] ان کے دل میں جو ہے اسے اللہ ہی خوب جانتا ہے' اگر میں ایسی بات کہوں تو یقیناً میرا شمار ظالموں میں ہو جائے گا۔[۳] (۳۱)

قَالُوْا يٰنُوْحُ قَدْ جٰدَلْتَنَا فَاَكْثَرْتَ جِدَالَنَا فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝۳۲

(قوم کے لوگوں نے) کہا اے نوح! تو نے ہم سے بحث کر لی اور خوب بحث کر لی۔[۴] اب تو جس چیز سے ہمیں دھمکا رہا ہے وہی ہمارے پاس لے آ' اگر تو سچوں میں ہے۔[۵] (۳۲)

قَالَ اِنَّمَا يَاْتِيْكُمْ بِهِ اللّٰهُ اِنْ شَاۗءَ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ۝۳۳

جواب دیا کہ اسے بھی اللہ تعالیٰ ہی لائے گا اگر وہ چاہے اور ہاں تم اسے ہرانے والے نہیں ہو۔[۶] (۳۳)

---

(۱) گویا ایسے لوگوں کو اپنے سے دور کرنا' اللہ کے غضب اور ناراضی کا باعث ہے۔

(۲) بلکہ اللہ تعالیٰ نے تو انہیں ایمان کی صورت میں خیر عظیم عطا کر رکھا ہے اور جس کی بنیاد پر وہ آخرت میں بھی جنت کی نعمتوں سے لطف اندوز ہوں گے اور دنیا میں بھی اللہ تعالیٰ چاہے گا' تو بلند مرتبے سے ہمکنار ہوں گے۔ گویا تمہارا ان کو حقیر سمجھنا ان کے لیے کسی نقصان کا باعث نہیں' البتہ تم ہی عنداللہ مجرم ٹھہرو گے کہ اللہ کے نیک بندوں کو' جن کا اللہ کے ہاں بڑا مقام ہے' تم حقیر اور فرومایہ سمجھتے ہو۔

(۳) کیونکہ میں ان کی بابت ایسی بات کہوں جس کا مجھے علم نہیں' صرف اللہ جانتا ہے' تو یہ ظلم ہے۔

(۴) لیکن اس کے باوجود ہم ایمان نہیں لائے۔

(۵) یہ وہی حماقت ہے جس کا ارتکاب گمراہ قومیں کرتی آئی ہیں کہ وہ اپنے پیغمبر سے کہتی رہی ہیں کہ اگر تو سچا ہے تو ہم پر عذاب نازل کروا کر ہمیں تباہ کروا دے۔ حالانکہ ان میں عقل ہوتی' تو وہ کہتیں کہ اگر تو سچا ہے اور واقعی اللہ کا رسول ہے' تو ہمارے لیے بھی دعا کر کہ اللہ تعالیٰ ہمارا سینہ بھی کھول دے تاکہ ہم اسے اپنالیں۔

(۶) یعنی عذاب کا آنا خالص اللہ کی مشیت پر موقوف ہے' یہ نہیں ہے کہ جب میں چاہوں' تم پر عذاب آجائے۔ تاہم جب اللہ عذاب کا فیصلہ کر لے گا یا بھیج دے گا' تو پھر اس کو کوئی عاجز کرنے والا نہیں ہے۔

وَلَا يَنْفَعُكُمْ نُصْحِيْٓ اِنْ اَرَدْتُّ اَنْ اَنْصَحَ لَكُمْ اِنْ كَانَ اللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يُّغْوِيَكُمْ هُوَ رَبُّكُمْ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۳۴﴾

تمہیں میری خیر خواہی کچھ بھی نفع نہیں دے سکتی‘ گو میں کتنی ہی تمہاری خیر خواہی کیوں نہ چاہوں‘ بشرطیکہ اللہ کا ارادہ تمہیں گمراہ کرنے کا ہو‘ [۱] وہی تم سب کا پروردگار ہے [۲] اور اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔(۳۴)

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ قُلْ اِنِ افْتَرَيْتُهٗ فَعَلَيَّ اِجْرَامِيْ وَاَنَا بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُجْرِمُوْنَ ﴿۳۵﴾

کیا یہ کہتے ہیں کہ اسے خود اسی نے گھڑ لیا ہے؟ تو جواب دے کہ اگر میں نے اسے گھڑ لیا ہو تو میرا گناہ مجھ پر ہے اور میں ان گناہوں سے بری ہوں جو تم کر رہے ہو۔ [۳] (۳۵)

وَاُوْحِيَ اِلٰى نُوْحٍ اَنَّهٗ لَنْ يُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ فَلَا تَبْتَىِٕسْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿۳۶﴾

نوح کی طرف وحی بھیجی گئی کہ تیری قوم میں سے جو ایمان لا چکے ان کے سوا اور کوئی اب ایمان لائے گا ہی نہیں‘ پس تو ان کے کاموں پر غمگین نہ ہو۔ [۴] (۳۶)

---

(۱) اِغوآءٌ بمعنی اضلال (گمراہ کرنا) ہے۔ یعنی تمہارا کفر و حجود اگر اس مقام پر پہنچ چکا ہے‘ جہاں سے کسی انسان کا پلٹ کر آنا اور ہدایت کو اپنا لینا‘ ناممکن ہے‘ تو اسی کیفیت کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مہر لگا دینا کہا جاتا ہے‘ جس کے بعد ہدایت کی کوئی امید باقی نہیں رہ جاتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تم بھی اسی خطرناک موڑ تک پہنچ چکے ہو تو پھر میں تمہاری خیر خواہی بھی کرنی چاہوں یعنی ہدایت پر لانے کی اور زیادہ کوششیں کروں‘ تو یہ کوشش اور خیر خواہی تمہارے لیے مفید نہیں‘ کیونکہ تم گمراہی کے آخری مقام پر پہنچ چکے ہو۔

(۲) ہدایت اور گمراہی بھی اسی کے ہاتھ میں ہے اور اسی کی طرف تم سب کو لوٹ کر جانا ہے‘ جہاں وہ تمہیں تمہارے عملوں کی جزا دے گا۔ نیکوں کو ان کے نیک عمل کی جزا اور بروں کو ان کی برائی کی سزا دے گا۔

(۳) بعض مفسرین کے نزدیک یہ مکالمہ قوم نوح علیہ السلام اور حضرت نوح علیہ السلام کے درمیان ہوا اور بعض کا خیال ہے کہ یہ جملہ معترضہ کے طور پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور مشرکین مکہ کے درمیان ہونے والی گفتگو ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہ قرآن میرا گھڑا ہوا ہے اور میں اللہ کی طرف منسوب کرنے میں جھوٹا ہوں تو یہ میرا جرم ہے‘ اس کی سزا میں ہی بھگتوں گا۔ لیکن تم جو کچھ کر رہے ہو‘ جس سے میں بری ہوں‘ اس کا بھی تمہیں پتہ ہے؟ اس کا وبال تو مجھ پر نہیں‘ تم پر ہی پڑے گا کیا اس کی بھی تمہیں کچھ فکر ہے؟

(۴) یہ اس وقت کہا گیا کہ جب قوم نوح علیہ السلام نے عذاب کا مطالبہ کیا اور حضرت نوح علیہ السلام نے بارگاہ الٰہی میں دعا کی کہ یا رب! زمین پر ایک کافر بھی بسنے والا نہ رہنے دے۔ اللہ نے فرمایا‘ اب مزید کوئی ایمان نہیں لائے گا‘ تو ان پر غم مت کھا۔

وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِأَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا وَلَا تُخَاطِبْنِي فِي الَّذِينَ ظَلَمُوا ۚ إِنَّهُم مُّغْرَقُونَ ﴿٣٧﴾

اور ایک کشتی ہماری آنکھوں کے سامنے اور ہماری وحی سے تیار کر[1] اور ظالموں کے بارے میں ہم سے کوئی بات چیت نہ کر وہ پانی میں ڈبو دیے جانے والے ہیں۔[2] (۳۷)

وَيَصْنَعُ الْفُلْكَ وَكُلَّمَا مَرَّ عَلَيْهِ مَلَأٌ مِّن قَوْمِهِ سَخِرُوا مِنْهُ ۚ قَالَ إِن تَسْخَرُوا مِنَّا فَإِنَّا نَسْخَرُ مِنكُمْ كَمَا تَسْخَرُونَ ﴿٣٨﴾

وہ (نوح) کشتی بنانے لگے ان کی قوم کے جو سردار ان کے پاس سے گزرتے وہ ان کا مذاق اڑاتے،[3] وہ کہتے اگر تم ہمارا مذاق اڑاتے ہو تو ہم بھی تم پر ایک دن ہنسیں گے جیسے تم ہم پر ہنستے ہو۔(۳۸)

فَسَوْفَ تَعْلَمُونَ مَن يَأْتِيهِ عَذَابٌ يُخْزِيهِ وَيَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيمٌ ﴿٣٩﴾

تمہیں بہت جلد معلوم ہو جائے گا کہ کس پر عذاب آتا ہے جو اسے رسوا کرے اور اس پر ہیشگی کی سزا[4] اتر آئے۔(۳۹)

حَتَّىٰ إِذَا جَاءَ أَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّورُ قُلْنَا احْمِلْ فِيهَا مِن كُلٍّ

یہاں تک کہ جب ہمارا حکم آپہنچا اور تنور ابلنے لگا[5] ہم نے کہا کہ اس کشتی میں ہر قسم کے (جانداروں میں سے)

---

(۱) "یعنی ہماری آنکھوں کے سامنے" اور "ہماری دیکھ بھال میں" اس آیت میں اللہ رب العزت کے لئے صفت "عین" کا اثبات ہے جس پر ایمان رکھنا ضروری ہے۔ اور "ہماری وحی سے" کا مطلب' اس کے طول و عرض وغیرہ کی جو کیفیات ہم نے بتلائی ہیں' اس طرح اسے بنا۔ اس مقام پر بعض مفسرین نے کشتی کے طول و عرض' اس کی منزلوں اور کس قسم کی لکڑی اور دیگر سامان اس میں استعمال کیا گیا' اس کی تفصیل بیان کی ہے' جو ظاہر بات ہے کہ کسی مستند ماخذ پر مبنی نہیں ہے۔ اس کی پوری تفصیل کا صحیح علم صرف اللہ ہی کو ہے۔

(۲) بعض نے اس سے مراد حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے اور ان کی اہلیہ کو لیا ہے جو مومن نہیں تھے اور غرق ہونے والوں میں سے تھے۔ بعض نے اس سے غرق ہونے والی پوری قوم مراد لی ہے اور مطلب یہ ہے کہ ان کے لیے کوئی مہلت طلب مت کرنا کیونکہ اب ان کے ہلاک ہونے کا وقت آگیا ہے یا یہ مطلب ہے کہ ان کی ہلاکت کے لیے جلدی نہ کریں' وقت مقرر میں یہ سب غرق ہو جائیں گے' (فتح القدیر)

(۳) مثلاً کہتے 'نوح! نبی بنتے بنتے اب بڑھئی بن گئے ہو؟ یا اے نوح! خشکی میں کشتی کس لیے تیار کر رہے ہو؟

(۴) اس سے مراد جہنم کا دائمی عذاب ہے' جو اس دنیوی عذاب کے بعد ان کے لیے تیار ہے۔

(۵) اس سے بعض نے روٹی پکانے والے تنور' بعض نے مخصوص جگہیں مثلاً عین الوردہ اور بعض نے سطح زمین مراد لی ہے۔ حافظ ابن کثیر نے اسی آخری مفہوم کو ترجیح دی ہے یعنی ساری زمین ہی چشموں کی طرح ابل پڑی' اوپر سے آسمان کی بارش نے رہی سہی کسر پوری کر دی۔

زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَأَهْلَكَ إِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ وَمَنْ اٰمَنَ ۚ وَمَا اٰمَنَ مَعَهٗٓ إِلَّا قَلِيْلٌ ﴿۴۰﴾

جوڑے (یعنی) دو (جانور' ایک نر اور ایک مادہ) سوار کرا لے [۱] اور اپنے گھر کے لوگوں کو بھی' سوائے ان کے جن پر پہلے سے بات پڑ چکی ہے [۲] اور سب ایمان والوں کو بھی' [۳] اس کے ساتھ ایمان لانے والے بہت ہی کم تھے۔ [۴] (۴۰)

وَقَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا ۭ إِنَّ رَبِّيْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۴۱﴾

نوح علیہ السلام نے کہا' اس کشتی میں بیٹھ جاؤ اللہ ہی کے نام سے اس کا چلنا اور ٹھہرنا ہے' [۵] یقیناً میرا رب بڑی بخشش اور بڑے رحم والا ہے۔ (۴۱)

وَهِيَ تَجْرِيْ بِهِمْ فِيْ مَوْجٍ كَالْجِبَالِ ۣ وَنَادٰى نُوْحُۨ ابْنَهٗ

وہ کشتی انہیں پہاڑوں جیسی موجوں میں لے کر جا رہی

---

(۱) اس سے مراد مذکر اور مؤنث یعنی نر اور مادہ ہے۔ اس طرح ہر ذی روح مخلوق کا جوڑا کشتی میں رکھ لیا گیا اور بعض کہتے ہیں کہ نباتات بھی رکھے گئے تھے۔ واللہ اعلم۔

(۲) یعنی جن کا غرق ہونا تقدیر الٰہی میں ثبت ہے۔ اس سے مراد عام کفار ہیں' یا یہ استثناء أَهْلَكَ سے ہے یعنی اپنے گھر والوں کو بھی کشتی میں سوار کرا لے' سوائے ان کے جن پر اللہ کی بات سبقت کر گئی ہے یعنی ایک بیٹا (کنعان یا۔ یام) اور حضرت نوح علیہ السلام کی اہلیہ (وَاعِلَة) یہ دونوں کافر تھے' ان کو کشتی میں بیٹھنے والوں سے مستثنیٰ کر دیا گیا۔

(۳) یعنی سب اہل ایمان کو کشتی میں سوار کرا لے۔

(۴) بعض نے ان کی کل تعداد (مرد اور عورت ملا کر) ۸۰ اور بعض نے اس سے بھی کم بتلائی ہے۔ ان میں حضرت نوح علیہ السلام کے تین بیٹے' جو ایمان لانے والوں میں شامل تھے' سام' حام' یافث اور ان کی بیویاں اور چوتھی بیوی' یام کی تھی' جو کافر تھا' لیکن اس کی بیوی مسلمان ہونے کی وجہ سے کشتی میں سوار تھی۔ (ابن کثیر)

(۵) یعنی اللہ ہی کے نام سے اس کا پانی کی سطح پر چلنا اور اسی کے نام پر اس کا ٹھہرنا ہے۔ اس سے ایک مقصد اہل ایمان کو تسلی اور حوصلہ دینا بھی تھا کہ بلا خوف و خطر کشتی میں سوار ہو جاؤ' اللہ تعالیٰ ہی اس کشتی کا محافظ اور نگران ہے' اسی کے حکم سے چلے گی اور اسی کے حکم سے ٹھہرے گی۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے دوسرے مقام پر فرمایا کہ "اے نوح! جب تو اور تیرے ساتھی کشتی میں آرام سے بیٹھ جائیں تو کہو۔ ﴿ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ نَجّٰىنَا مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ٭ وَقُلْ رَّبِّ أَنْزِلْنِيْ مُنْزَلًا مُّبٰرَكًا وَّأَنْتَ خَيْرُ الْمُنْزِلِيْنَ ﴾ (المؤمنون - ۲۸'۲۹) "سب تعریف اللہ ہی کے لیے ہے' جس نے ہمیں ظالم لوگوں سے نجات عطا فرمائی اور کہہ کہ اے میرے رب! مجھے بابرکت اتارنا اتار اور تو ہی بہتر اتارنے والا ہے"۔

بعض علما نے کشتی یا سواری پر بیٹھتے وقت ﴿ بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا ﴾ ۔ کا پڑھنا مستحب قرار دیا ہے۔ مگر حدیث سے ﴿ سُبْحٰنَ الَّذِيْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ ٭ وَإِنَّآ إِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ ﴾ پڑھنا ثابت ہے۔

وَكَانَ فِىْ مَعْزِلٍ يّٰبُنَىَّ ارْكَبْ مَّعَنَا وَلَا تَكُنْ مَّعَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۴۲﴾

تھی [1] اور نوح (علیہ السلام) نے اپنے لڑکے کو جو ایک کنارے پر تھا، پکار کر کہا کہ اے میرے پیارے بچے ہمارے ساتھ سوار ہو جا اور کافروں میں شامل نہ رہ۔ [2] (۴۲)

قَالَ سَاٰوِیْۤ اِلٰى جَبَلٍ یَّعْصِمُنِیْ مِنَ الْمَآءِ ؕ قَالَ لَا عَاصِمَ الْیَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ ۚ وَحَالَ بَیْنَهُمَا الْمَوْجُ فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِیْنَ ﴿۴۳﴾

اس نے جواب دیا کہ میں تو کسی بڑے پہاڑ کی طرف پناہ میں آجاؤں گا جو مجھے پانی سے بچالے گا، [3] نوح علیہ السلام نے کہا آج اللہ کے امر سے بچانے والا کوئی نہیں، صرف وہی بچیں گے جن پر اللہ کا رحم ہوا۔ اسی وقت ان دونوں کے درمیان موج حائل ہو گئی اور وہ ڈوبنے والوں میں سے ہو گیا۔ [4] (۴۳)

وَقِیْلَ یٰۤاَرْضُ ابْلَعِیْ مَآءَكِ وَیٰسَمَآءُ اَقْلِعِیْ وَغِیْضَ الْمَآءُ

فرما دیا گیا کہ اے زمین اپنے پانی کو نگل جا [5] اور اے آسمان بس کر تھم جا، اسی وقت پانی سکھا دیا گیا اور کام پورا

---

(۱) یعنی جب زمین پر پانی تھا، حتیٰ کہ پہاڑ بھی پانی میں ڈوبے ہوئے تھے، یہ کشتی حضرت نوح علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کو اپنے دامن میں سمیٹے، اللہ کے حکم سے اور اس کی حفاظت میں پہاڑ کی طرح رواں دواں تھی۔ ورنہ اتنے طوفانی پانی میں کشتی کی حیثیت ہی کیا ہوتی ہے؟ اسی لیے دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے اسے بطور احسان ذکر فرمایا۔
﴿ اِنَّا لَمَّا طَغَا الْمَآءُ حَمَلْنٰكُمْ فِی الْجَارِیَةِ ۙ لِنَجْعَلَهَا لَكُمْ تَذْكِرَةً وَّتَعِیَهَاۤ اُذُنٌ وَّاعِیَةٌ ﴾ (الحاقة۔ ۱۱،۱۲) جب پانی میں طغیانی آگئی تو اس وقت ہم نے تمہیں کشتی میں چڑھا لیا تاکہ اسے تمہارے لیے نصیحت اور یادگار بنا دیں اور تاکہ یاد رکھنے والے کان اسے یاد رکھیں۔
﴿ وَحَمَلْنٰهُ عَلٰى ذَاتِ اَلْوَاحٍ وَّدُسُرٍ ۙ تَجْرِیْ بِاَعْیُنِنَا ۚ جَزَآءً لِّمَنْ كَانَ كُفِرَ ﴾ (القمر۔ ۱۳،۱۴) "اور ہم نے اسے تختوں اور کیلوں والی کشتی میں سوار کر لیا، جو ہماری آنکھوں کے سامنے چل رہی تھی۔ بدلہ اس کی طرف سے جس کا کفر کیا گیا تھا"۔
(۲) یہ حضرت نوح علیہ السلام کا چوتھا بیٹا تھا جس کا لقب کنعان اور نام "یام" تھا، اسے حضرت نوح علیہ السلام نے دعوت دی کہ مسلمان ہو جا اور کافروں کے ساتھ شامل رہ کر غرق ہونے والوں میں سے مت ہو۔
(۳) اس کا خیال تھا کہ کسی بڑے پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ کر میں پناہ حاصل کر لوں گا، وہاں پانی کیوں کر پہنچ سکے گا؟
(۴) باپ بیٹے کے درمیان یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ ایک طوفانی موج نے اسے اپنی طغیانی کی زد میں لے لیا۔
(۵) نگلنا، کا استعمال جانور کے لیے ہوتا ہے کہ وہ اپنے منہ کی خوراک کو نگل جاتا ہے۔ یہاں پانی کے خشک ہونے کو نگل جانے سے تعبیر کرنے میں یہ حکمت معلوم ہوتی ہے کہ پانی بتدریج خشک نہیں ہوا تھا بلکہ اللہ کے حکم سے زمین نے سارا پانی دفعتاً اس طرح اپنے اندر نگل لیا جس طرح جانور لقمہ نگل جاتا ہے۔

وَقُضِيَ الْاَمْرُ وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُوْدِيِّ وَقِيْلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۴﴾

کر دیا گیا[1] اور کشتی "جودی" نامی[2] پہاڑ پر جا لگی اور فرمایا گیا کہ ظالم لوگوں پر لعنت نازل ہو۔[3] (۴۴)

وَنَادٰى نُوْحٌ رَّبَّهٗ فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابْنِيْ مِنْ اَهْلِيْ وَاِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَاَنْتَ اَحْكَمُ الْحٰكِمِيْنَ ﴿۴۵﴾

نوح علیہ السلام نے اپنے پروردگار کو پکارا اور کہا کہ میرے رب میرا بیٹا تو میرے گھر والوں میں سے ہے، یقیناً تیرا وعدہ بالکل سچا ہے اور تو تمام حاکموں سے بہتر حاکم ہے۔[4] (۴۵)

قَالَ يٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ ۚ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ ۫ فَلَا تَسْـَٔلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۭ اِنِّيْٓ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۴۶﴾

اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے نوح یقیناً وہ تیرے گھرانے سے نہیں ہے،[5] اس کے کام بالکل ہی ناشائستہ ہیں[6] تجھے ہرگز وہ چیز نہ مانگنی چاہیے جس کا تجھے مطلقاً علم نہ ہو،[7]

---

(۱) یعنی تمام کافروں کو غرق آب کر دیا گیا۔

(۲) جودی، پہاڑ کا نام ہے جو بقول بعض موصل کے قریب ہے، حضرت نوح علیہ السلام کی قوم بھی اسی کے قریب آباد تھی۔

(۳) بُعْدٌ، یہ ہلاکت اور لعنت الٰہی کے معنی میں ہے اور قرآن کریم میں بطور خاص غضب الٰہی کی مستحق بننے والی قوموں کے لیے اسے کئی جگہ استعمال کیا گیا ہے۔

(۴) حضرت نوح علیہ السلام نے غالباً شفقت پدری کے جذبے سے مغلوب ہو کر بارگاہ الٰہی میں یہ دعا کی اور بعض کہتے ہیں کہ انہیں یہ خیال تھا کہ شاید یہ مسلمان ہو جائے گا، اس لیے اس کے بارے میں یہ استدعا کی۔

(۵) حضرت نوح علیہ السلام نے قرابت نسبی کا لحاظ کرتے ہوئے اسے اپنا بیٹا قرار دیا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ایمان کی بنیاد پر قرابت دین کے اعتبار سے اس بات کی نفی فرمائی کہ وہ تیرے گھرانے سے ہے۔ اس لیے کہ ایک نبی کا اصل گھرانہ تو وہی ہے جو اس پر ایمان لائے، چاہے وہ کوئی بھی ہو۔ اور اگر کوئی ایمان نہ لائے تو چاہے وہ نبی کا باپ ہو، بیٹا ہو یا بیوی، وہ نبی کے گھرانے کا فرد نہیں۔

(۶) یہ اللہ تعالیٰ نے اس کی علت بیان فرما دی۔ اس سے معلوم ہوا کہ جس کے پاس ایمان اور عمل صالح نہیں ہو گا، اسے اللہ کے عذاب سے اللہ کا پیغمبر بھی بچانے پر قادر نہیں۔ آج کل لوگ پیروں، فقیروں اور سجادہ نشینوں سے وابستگی کو ہی نجات کے لیے کافی سمجھتے ہیں اور عمل صالح کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے حالانکہ جب عمل صالح کے بغیر نبی سے نسبی قرابت بھی کام نہیں آتی، تو یہ وابستگیاں کیا کام آسکتی ہیں؟

(۷) اس سے معلوم ہوا کہ نبی عالم الغیب نہیں ہوتا، اس کو اتنا ہی علم ہوتا ہے جتنا وحی کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ اسے عطا فرما دیتا ہے۔ اگر حضرت نوح علیہ السلام کو پہلے سے علم ہوتا کہ ان کی درخواست قبول نہیں ہو گی تو یقیناً وہ اس سے پرہیز فرماتے۔

قَالَ رَبِّ اِنِّیْٓ اَعُوْذُ بِكَ اَنْ اَسْـَٔلَكَ مَا لَیْسَ لِیْ بِهٖ عِلْمٌ ؕ وَ اِلَّا تَغْفِرْ لِیْ وَ تَرْحَمْنِیْٓ اَكُنْ مِّنَ الْخٰسِرِیْنَ ﴿۴۷﴾

میں تجھے نصیحت کرتا ہوں کہ تو جاہلوں میں سے اپنا شمار کرانے سے باز رہے۔[۱] (۴۶)

نوح نے کہا میرے پالنہار میں تیری ہی پناہ چاہتا ہوں اس بات سے کہ تجھ سے وہ مانگوں جس کا مجھے علم ہی نہ ہو اگر تو مجھے نہ بخشے گا اور تو مجھ پر رحم نہ فرمائے گا' تو میں خسارہ پانے والوں میں ہو جاؤں گا۔[۲] (۴۷)

قِیْلَ یٰنُوْحُ اهْبِطْ بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَ بَرَكٰتٍ عَلَیْكَ وَ عَلٰۤى اُمَمٍ مِّمَّنْ مَّعَكَ ؕ وَ اُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمْ ثُمَّ یَمَسُّهُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴿۴۸﴾

فرما دیا گیا کہ اے نوح! ہماری جانب سے سلامتی اور ان برکتوں کے ساتھ اتر'[۳] جو تجھ پر ہیں اور تیرے ساتھ کی بہت سی جماعتوں پر[۴] اور بہت سی وہ امتیں ہوں گی جنہیں ہم فائدہ تو ضرور پہنچائیں گے لیکن پھر انہیں ہماری طرف سے دردناک عذاب پہنچے گا۔[۵] (۴۸)

تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَیْبِ نُوْحِیْهَاۤ اِلَیْكَ ۚ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَاۤ اَنْتَ وَ لَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا ۛؕ فَاصْبِرْ ۛؕ اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِیْنَ ﴿۴۹﴾

یہ خبریں غیب کی خبروں میں سے ہیں جن کی وحی ہم آپ کی طرف کرتے ہیں انہیں اس سے پہلے آپ جانتے تھے اور نہ آپ کی قوم'[۶] اس لیے آپ صبر

---

(۱) یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت نوح علیہ السلام کو نصیحت ہے' جس کا مقصد ان کو اس مقام بلند پر فائز کرنا ہے جو علمائے عاملین کے لیے اللہ کی بارگاہ میں ہے۔

(۲) جب حضرت نوح علیہ السلام یہ بات جان گئے کہ ان کا سوال واقع کے مطابق نہیں تھا' تو فوراً اس سے رجوع فرمالیا اور اللہ تعالیٰ سے اس کی رحمت و مغفرت کے طالب ہوئے۔

(۳) یہ اترنا کشتی سے یا اس پہاڑ سے ہے جس پر کشتی جاکر ٹھہر گئی تھی۔

(۴) اس سے مراد یا تو وہ گروہ ہیں جو حضرت نوح علیہ السلام کے ساتھ کشتی میں سوار تھے' یا آئندہ ہونے والے وہ گروہ ہیں جو ان کی نسل سے ہونے والے تھے۔ اگلے فقرے کے پیش نظر یہ دوسرا مفہوم زیادہ صحیح ہے۔

(۵) یہ وہ گروہ ہیں جو کشتی میں بچ جانے والوں کی نسل سے قیامت تک ہوں گے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کافروں کو دنیا کی چند روزہ زندگی گزارنے کے لیے ہم دنیا کا سازوسامان ضرور دیں گے لیکن بالآخر عذاب الیم سے دوچار ہوں گے۔

(۶) یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب ہے اور آپ سے علم غیب کی نفی کی جا رہی ہے کہ یہ غیب کی خبریں ہیں جن سے ہم آپ کو خبردار کر رہے ہیں ورنہ آپ اور آپ کی قوم ان سے لاعلم تھی۔

کرتے رہیے (یقین مانیئے) کہ انجام کار پرہیزگاروں کے لیے ہی ہے۔[1] (۴۹)

وَإِلَىٰ عَادٍ أَخَاهُمْ هُودًا ۚ قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ ۖ إِنْ أَنتُمْ إِلَّا مُفْتَرُونَ ﴿٥٠﴾

اور قوم عاد کی طرف ان کے بھائی ہود کو ہم[2] نے بھیجا' اس نے کہا میری قوم والو! اللہ ہی کی عبادت کرو' اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں' تم تو صرف بہتان باندھ رہے ہو۔[3] (۵۰)

يَا قَوْمِ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا ۖ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى الَّذِي فَطَرَنِي ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿٥١﴾

اے میری قوم! میں تم سے اس کی کوئی اجرت نہیں مانگتا' میرا اجر اس کے ذمے ہے جس نے مجھے پیدا کیا ہے تو کیا پھر بھی تم عقل سے کام نہیں لیتے۔[4] (۵۱)

وَيَا قَوْمِ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوبُوا إِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَاءَ عَلَيْكُم مِّدْرَارًا وَيَزِدْكُمْ قُوَّةً إِلَىٰ قُوَّتِكُمْ وَلَا تَتَوَلَّوْا

اے میری قوم کے لوگو! تم اپنے پالنے والے سے اپنی تقصیروں کی معافی طلب کرو اور اس کی جناب میں توبہ کرو' تاکہ وہ برسنے والے بادل تم پر بھیج دے اور

---

(۱) یعنی آپ ﷺ کی قوم آپ کی جو تکذیب کر رہی ہے اور آپ ﷺ کو ایذائیں پہنچا رہی ہے' اس پر صبر سے کام لیجئے' اس لیے کہ ہم آپ کے مددگار ہیں اور حسن انجام آپ کے اور آپ کے پیروکاروں کے لیے ہی ہے' جو تقویٰ کی صفت سے متصف ہیں۔ عاقبت' دنیا و آخرت کے اچھے انجام کو کہتے ہیں۔ اس میں متقین کے لیے بڑی بشارت ہے کہ ابتدا میں چاہے انہیں کتنا بھی مشکلات سے دوچار ہونا پڑے' تاہم بالآخر اللہ کی مدد و نصرت اور حسن انجام کے وہی مستحق ہیں۔ جس طرح دوسرے مقام پر فرمایا ﴿ إِنَّا لَنَنصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِينَ آمَنُوا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُومُ الْأَشْهَادُ ﴾ —— (المؤمن۔۵۱) یقیناً ہم اپنے رسولوں کی اور ایمان والوں کی مدد زندگانی' دنیا میں بھی کریں گے اور اس دن بھی جب گواہی دینے والے کھڑے ہوں گے۔

﴿وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِينَ ۞ إِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنصُورُونَ ۞ وَإِنَّ جُندَنَا لَهُمُ الْغَالِبُونَ﴾ (الصافات۔ ۱۷۱۔۱۷۳) "اور البتہ ہمارا وعدہ پہلے ہی اپنے رسولوں کے لیے صادر ہو چکا ہے کہ وہ مظفر و منصور ہوں گے اور ہمارا ہی لشکر غالب اور برتر رہے گا"۔

(۲) بھائی سے مراد انہی کی قوم کا ایک فرد۔

(۳) یعنی اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہرا کر تم اللہ پر جھوٹ باندھ رہے ہو۔

(۴) اور یہ نہیں سمجھتے کہ جو بغیر اجرت اور لالچ کے تمہیں اللہ کی طرف بلا رہا ہے' وہ تمہارا خیر خواہ ہے۔ آیت میں یاقوم اسے دعوت کا ایک طریق کار معلوم ہوتا ہے یعنی بجائے یہ کہنے کے "اے کافرو" "اے مشرکو" اے میری قوم سے مخاطب کیا گیا ہے۔

مُجْرِمِيْنَ ﴿۵۲﴾

تمہاری طاقت پر اور طاقت قوت بڑھا دے [1] اور تم جرم کرتے ہوئے روگردانی نہ کرو۔ [2] (۵۲)

قَالُوْا يٰهُوْدُ مَا جِئْتَنَا بِبَيِّنَةٍ وَّمَا نَحْنُ بِتَارِكِيْٓ اٰلِهَتِنَا عَنْ قَوْلِكَ وَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۵۳﴾

انہوں نے کہا اے ہود! تو ہمارے پاس کوئی دلیل تو لایا نہیں اور ہم صرف تیرے کہنے سے اپنے معبودوں کو چھوڑنے والے نہیں اور نہ ہم تجھ پر ایمان لانے والے ہیں۔ [3] (۵۳)

اِنْ نَّقُوْلُ اِلَّا اعْتَرٰىكَ بَعْضُ اٰلِهَتِنَا بِسُوْٓءٍ ۭ قَالَ اِنِّىْٓ اُشْهِدُ اللّٰهَ وَاشْهَدُوْٓا اَنِّىْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ﴿۵۴﴾

بلکہ ہم تو یہی کہتے ہیں کہ تو ہمارے کسی معبود کے برے جھپٹے میں آگیا ہے۔ [4] اس نے جواب دیا کہ میں اللہ کو گواہ کرتا ہوں اور تم بھی گواہ رہو کہ میں تو اللہ کے سوا ان سب سے بیزار ہوں، جنہیں تم شریک بنا رہے ہو۔ [5] (۵۴)

---

(۱) حضرت ہود علیہ السلام نے توبہ و استغفار کی تلقین اپنی امت یعنی اپنی قوم کو کی اور اس کے وہ فوائد بیان فرمائے جو توبہ و استغفار کرنے والی قوم کو حاصل ہوتے ہیں۔ جس طرح کہ قرآن کریم میں اور بھی بعض مقامات پر یہ فوائد بیان کیے گئے ہیں۔ (ملاحظہ ہو سورۂ نوح، ۱۱) اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی فرمان ہے۔ مَنْ لَزِمَ الِاسْتِغْفَارَ جَعَلَ اللّٰهُ لَهُ مِنْ كُلِّ هَمٍّ فَرَجًا، وَمِنْ كُلِّ ضِيقٍ مَخْرَجًا وَرَزَقَهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ (أبوداود۔ كتاب الوتر۔ باب في الاستغفار۔ نمبر ۱۵۱۸۔ وابن ماجه، نمبر ۳۸۱۹) "جو پابندی سے استغفار کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے لیے ہر فکر سے کشادگی، اور ہر تنگی سے راستہ بنا دیتا ہے اور اس کو ایسی جگہ سے روزی دیتا ہے جو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتی"۔

(۲) یعنی میں تمہیں جو دعوت دے رہا ہوں، اس سے اعراض اور اپنے کفر پر اصرار مت کرو۔ ایسا کرو گے تو اللہ کی بارگاہ میں مجرم اور گناہ گار بن کر پیش ہو گے۔

(۳) ایک نبی دلائل و براہین کی پوری قوت اپنے ساتھ رکھتا ہے۔ لیکن شپرہ چشموں کو وہ نظر نہیں آتے قوم ہود علیہ السلام نے بھی اسی ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا کہ ہم بغیر دلیل کے محض تیرے کہنے سے اپنے معبودوں کو کس طرح چھوڑ دیں؟

(۴) یعنی تو جو ہمارے معبودوں کی توہین اور گستاخی کرتا ہے کہ یہ کچھ نہیں کر سکتے، معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے معبودوں نے ہی تیری اس گستاخی پر تجھے کچھ کر دیا ہے۔ اور تیرا دماغ ماؤف ہو گیا ہے۔ جیسے آج کل کے نام نہاد مسلمان بھی اس قسم کے توہمات کا شکار ہیں، جب انہیں کہا جاتا ہے کہ یہ فوت شدہ اشخاص اور بزرگ کچھ نہیں کر سکتے، تو کہتے ہیں کہ یہ ان کی شان میں گستاخی ہے اور خطرہ ہے کہ اس طرح کی گستاخی کرنے والوں کا وہ بیڑا غرق کر دیں۔ نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ هٰذِهِ الْخُرَافَاتِ وَالْأَكَاذِيْبِ.

(۵) یعنی میں ان تمام بتوں اور معبودوں سے بیزار ہوں اور تمہارا یہ عقیدہ کہ انہوں نے مجھے کچھ کر دیا ہے، بالکل غلط ہے، ان کے اندر یہ قدرت ہی نہیں کہ کسی کو مافوق الاسباب طریقے سے نفع یا نقصان پہنچا سکیں۔

مِنْ دُوْنِهٖ فَكِيْدُوْنِيْ جَمِيْعًا ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنِ ﴿۵۵﴾

اچھا تم سب مل کر میرے خلاف چالیں چل لو اور مجھے بالکل مہلت بھی نہ دو۔ (۱) (۵۵)

اِنِّيْ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ رَبِّيْ وَرَبِّكُمْ ۭ مَا مِنْ دَآبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِيَتِهَا ۭ اِنَّ رَبِّيْ عَلٰي صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۵۶﴾

میرا بھروسہ صرف اللہ تعالیٰ پر ہی ہے' جو میرا اور تم سب کا پروردگار ہے جتنے بھی پاؤں دھرنے والے ہیں سب کی پیشانی وہی تھامے ہوئے (۲) ہے۔ یقیناً میرا رب بالکل صحیح راہ پر ہے۔ (۳) (۵۶)

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ مَّآ اُرْسِلْتُ بِهٖٓ اِلَيْكُمْ ۭ وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّيْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۚ وَلَا تَضُرُّوْنَهٗ شَـيْـــًٔا ۭ اِنَّ رَبِّيْ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ حَفِيْظٌ ﴿۵۷﴾

پس اگر تم روگردانی کرو تو کرو میں تو تمہیں وہ پیغام پہنچا چکا جو دے کر مجھے تمہاری طرف بھیجا گیا تھا۔ (۴) میرا رب تمہارے قائم مقام اور لوگوں کو کر دے گا اور تم اس کا کچھ بھی بگاڑ نہ سکو گے' (۵) یقیناً میرا پروردگار ہر چیز پر نگہبان ہے۔ (۶) (۵۷)

وَلَمَّا جَاۗءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا هُوْدًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا ۚ

اور جب ہمارا حکم آپہنچا تو ہم نے ہود کو اور اس کے مسلمان ساتھیوں کو اپنی خاص رحمت سے نجات عطا

---

(۱) اور اگر تمہیں میری بات پر یقین نہیں ہے بلکہ تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو کہ یہ بت کچھ کر سکتے ہیں تو لو! میں حاضر ہوں' تم اور تمہارے معبود سب مل کر میرے خلاف کچھ کر کے دکھاؤ۔ مزید اس سے نبی کے اس انداز کا پتہ چلتا ہے کہ وہ کس قدر بصیرت پر ہوتا ہے کہ اسے اپنے حق پر ہونے کا یقین ہوتا ہے۔

(۲) یعنی جس ذات کے ہاتھ میں ہر چیز کا قبضہ و تصرف ہے' وہ وہی ذات ہے جو میرا اور تمہارا رب ہے' میرا توکل اسی پر ہے۔ مقصد ان الفاظ سے حضرت ہود علیہ السلام کا یہ ہے کہ جن کو تم نے اللہ کا شریک ٹھہرا رکھا ہے' ان پر بھی اللہ ہی کا قبضہ و تصرف ہے' اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ جو چاہے کر سکتا ہے' وہ کسی کا کچھ نہیں کر سکتے۔

(۳) یعنی وہ جو توحید کی دعوت دے رہا ہے یقیناً یہ دعوت ہی صراط مستقیم ہے' اسی پر چل کر نجات اور کامیابی سے ہم کنار ہو سکتے ہو اور اس صراط مستقیم سے اعراض و انحراف تباہی و بربادی کا باعث ہے۔

(۴) یعنی اس کے بعد میری ذمے داری ختم اور تم پر حجت تمام ہو گئی۔

(۵) یعنی تمہیں تباہ کر کے تمہاری زمینوں اور املاک کا وہ دوسروں کو مالک بنا دے' تو وہ ایسا کرنے پر قادر ہے اور تم اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ بلکہ وہ اپنی مشیت و حکمت کے مطابق ایسا کرتا رہتا ہے۔

(۶) یقیناً وہ مجھے تمہارے مکر و فریب اور سازشوں سے بھی محفوظ رکھے گا اور شیطانی چالوں سے بھی بچائے گا۔ علاوہ ازیں ہر نیک و بد کو ان کے اعمال کے مطابق اچھی اور بری جزا بھی دے گا۔

وَنَجَّيْنٰهُمْ مِّنْ عَذَابٍ غَلِيْظٍ ﴿۵۸﴾

فرمائی اور ہم نے ان سب کو سخت عذاب سے بچا لیا۔ (۱) (۵۸)

وَتِلْكَ عَادٌ جَحَدُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَعَصَوْا رُسُلَهٗ وَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ ﴿۵۹﴾

یہ تھی قوم عاد' جنہوں نے اپنے رب کی آیتوں کا انکار کیا اور اس کے رسولوں کی (۲) نافرمانی کی اور ہر ایک سرکش نافرمان کے حکم کی تابعداری کی۔ (۳) (۵۹)

وَاُتْبِعُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً وَّيَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اَلَآ اِنَّ عَادًا كَفَرُوْا رَبَّهُمْ ۭ اَلَا بُعْدًا لِّعَادٍ قَوْمِ هُوْدٍ ﴿۶۰﴾

دنیا میں بھی ان کے پیچھے لعنت لگا دی گئی اور قیامت کے دن بھی' (۴) دیکھ لو قوم عاد نے اپنے رب سے کفر کیا' ہود کی قوم عاد پر دوری ہو۔ (۵) (۶۰)

وَاِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ۘ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ

اور قوم ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح کو بھیجا' (۶) اس

---

(۱) سخت عذاب سے مراد وہی الرِّيْحَ الْعَقِيْمَ تیز آندھی کا عذاب ہے جس کے ذریعے سے حضرت ہود علیہ السلام کی قوم عاد کو ہلاک کیا گیا اور جس سے حضرت ہود علیہ السلام اور ان پر ایمان لانے والوں کو بچا لیا گیا۔

(۲) عاد کی طرف صرف ایک نبی حضرت ہود علیہ السلام ہی بھیجے گئے تھے' یہاں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ انہوں نے اللہ کے رسولوں کی نافرمانی کی۔ اس سے یا تو یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ ایک رسول کی تکذیب' یہ گویا تمام رسولوں کی تکذیب ہے۔ کیونکہ تمام رسولوں پر ایمان رکھنا ضروری ہے۔ یا مطلب یہ ہے کہ یہ قوم اپنے کفر و انکار میں اتنی آگے بڑھ چکی تھی کہ حضرت ہود علیہ السلام کے بعد اگر ہم اس قوم میں متعدد رسول بھی بھیجتے' تو یہ قوم ان سب کی تکذیب ہی کرتی۔ اور اس سے قطعاً یہ امید نہیں تھی کہ وہ کسی بھی رسول پر ایمان لے آتی۔ یا ہو سکتا ہے کہ اور بھی انبیا بھیجے گئے ہوں اور اس قوم نے ہر ایک کی تکذیب کی۔

(۳) یعنی اللہ کے پیغمبروں کی تو تکذیب کی لیکن جو لوگ اللہ کے حکموں سے سرکشی کرنے والے اور نافرمان تھے' ان کی اس قوم نے پیروی کی۔

(۴) لَعْنَةٌ کا مطلب ہے اللہ کی رحمت سے دوری' امور خیر سے محرومی اور لوگوں کی طرف سے ملامت و بیزاری۔ دنیا میں یہ لعنت اس طرح کہ اہل ایمان میں ان کا ذکر ہمیشہ ملامت و بیزاری کے انداز میں ہو گا اور قیامت میں اس طرح کہ وہاں علیٰ رؤوس الاشہاد ذلت و رسوائی سے دوچار اور عذاب الٰہی میں مبتلا ہوں گے۔

(۵) بُعْدٌ کا یہ لفظ رحمت سے دوری اور لعنت ہلاکت کے معنی کے لیے ہے' جیسا کہ اس سے قبل بھی وضاحت کی جا چکی ہے۔

(۶) وَاِلٰى ثَمُوْدَ عطف ہے ماقبل پر۔ یعنی وَاَرْسَلْنَا اِلٰى ثَمُوْدَ ہم نے ثمود کی طرف بھیجا۔ یہ قوم تبوک اور مدینہ کے درمیان مدائن صالح (حجر) میں رہائش پذیر تھی اور یہ قوم عاد کے بعد ہوئی۔ حضرت صالح علیہ السلام کو یہاں بھی ثمود کا بھائی کہا ہے' جس سے مراد انہی کے خاندان اور قبیلے کا ایک فرد ہے۔

غَيْرُهٗ ۭ هُوَ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَاسْتَعْمَرَكُمْ فِيْهَا فَاسْتَغْفِرُوْهُ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ ۭ اِنَّ رَبِّيْ قَرِيْبٌ مُّجِيْبٌ ۞

نے کہا کہ اے میری قوم تم اللہ کی عبادت کرو اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں،(۱) اسی نے تمہیں زمین سے پیدا کیا ہے(۲) اور اسی نے اس زمین میں تمہیں بسایا ہے،(۳) پس تم اس سے معافی طلب کرو اور اس کی طرف رجوع کرو۔ بیشک میرا رب قریب اور دعاؤں کا قبول کرنے والا ہے۔ (۶۱)

قَالُوْا يٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَآ اَتَنْهٰىنَآ اَنْ نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ اٰبَاۗؤُنَا وَاِنَّنَا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ ۞

انہوں نے کہا اے صالح! اس سے پہلے تو ہم تجھ سے بہت کچھ امیدیں لگائے ہوئے تھے، کیا تو ہمیں ان کی عبادتوں سے روک رہا ہے جن کی عبادت ہمارے باپ دادا کرتے چلے آئے، ہمیں تو اس دین میں حیران کن شک ہے جس کی طرف تو ہمیں بلا رہا ہے۔(۴) (۶۲)

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰي بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَاٰتٰىنِيْ مِنْهُ رَحْمَةً فَمَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ عَصَيْتُهٗ ۣ فَمَا تَزِيْدُوْنَنِيْ غَيْرَ تَخْسِيْرٍ ۞

اس نے جواب دیا کہ اے میری قوم کے لوگو! ذرا بتاؤ تو اگر میں اپنے رب کی طرف سے کسی مضبوط دلیل پر ہوا اور اس نے مجھے اپنے پاس کی رحمت عطا کی ہو،(۵) پھر

---

(۱) حضرت صالح علیہ السلام نے بھی سب سے پہلے اپنی قوم کو توحید کی دعوت دی، جس طرح کہ تمام انبیا کا طریق رہا ہے۔

(۲) یعنی ابتداءً تمہیں زمین سے پیدا کیا، وہ اس طرح کہ تمہارے باپ آدم علیہ السلام کی تخلیق مٹی سے ہوئی اور تمام انسان صلب آدم علیہ السلام سے پیدا ہوئے یوں گویا تمام انسانوں کی پیدائش زمین سے ہوئی۔ یا یہ مطلب ہے کہ تم جو کچھ کھاتے ہو، سب زمین ہی سے پیدا ہوتا ہے اور اسی خوراک سے وہ نطفہ بنتا ہے۔ جو رحم مادر میں جا کر وجود انسانی کا باعث ہوتا ہے۔

(۳) یعنی تمہارے اندر زمین کو بسانے اور آباد کرنے کی استعداد و صلاحیت پیدا کی، جس سے تم رہائش کے لیے مکان تعمیر کرتے، خوراک کے لیے کاشت کاری کرتے اور دیگر ضروریات زندگی مہیا کرنے کے لیے صنعت و حرفت سے کام لیتے ہو۔

(۴) یعنی پیغمبر اپنی قوم میں چونکہ اخلاق و کردار اور امانت و دیانت میں ممتاز ہوتا ہے، اس لیے قوم کی اس سے اچھی امیدیں وابستہ ہوتی ہیں۔ اسی اعتبار سے حضرت صالح علیہ السلام کی قوم نے بھی ان سے یہ کہا۔ لیکن دعوت توحید دیتے ہی ان کی امیدوں کا یہ مرکز، ان کی آنکھوں کا کانٹا بن گیا اور اس دین میں شک کا اظہار کیا جس کی طرف حضرت صالح علیہ السلام انہیں بلا رہے تھے یعنی دین توحید۔

(۵) بَيِّنَةٍ سے مراد وہ ایمان و یقین ہے، جو اللہ تعالیٰ پیغمبر کو عطا فرماتا ہے اور رحمت سے نبوت۔ جیسا کہ پہلے وضاحت گزر چکی ہے۔

اگر میں نے اس کی نافرمانی کر[1] لی تو کون ہے جو اس کے مقابلے میں میری مدد کرے؟ تم تو میرا نقصان ہی بڑھا رہے ہو۔[2] (۶۳)

وَيٰقَوْمِ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ قَرِيْبٌ ﴿۶۴﴾

اور اے میری قوم والو! یہ اللہ کی بھیجی ہوئی اونٹنی ہے جو تمہارے لیے ایک معجزہ ہے اب تم اسے اللہ کی زمین میں کھاتی ہوئی چھوڑ دو اور اسے کسی طرح کی ایذا نہ پہنچاؤ ورنہ فوری عذاب تمہیں پکڑ لے گا۔[3] (۶۴)

فَعَقَرُوْهَا فَقَالَ تَمَتَّعُوْا فِيْ دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ ذٰلِكَ وَعْدٌ غَيْرُ مَكْذُوْبٍ ﴿۶۵﴾

پھر بھی ان لوگوں نے اس اونٹنی کے پاؤں کاٹ ڈالے' اس پر صالح نے کہا کہ اچھا تم اپنے گھروں میں تین تین دن تک تو رہ سہ لو' یہ وعدہ جھوٹا نہیں ہے۔[4] (۶۵)

فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا صٰلِحًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَمِنْ خِزْيِ يَوْمِىٕذٍ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ ﴿۶۶﴾

پھر جب ہمارا فرمان آپہنچا'[5] ہم نے صالح کو اور ان پر ایمان لانے والوں کو اپنی رحمت سے اس سے بھی بچا لیا اور اس دن کی رسوائی سے بھی۔ یقیناً تیرا رب نہایت توانا اور غالب ہے۔(۶۶)

---

(۱) نافرمانی سے مراد یہ ہے کہ اگر میں تمہیں حق کی طرف اور اللہ واحد کی عبادت کی طرف بلانا چھوڑ دوں' جیسا کہ تم چاہتے ہو۔

(۲) یعنی اگر میں ایسا کروں تو تم مجھے کوئی فائدہ تو نہیں پہنچا سکتے' البتہ اس طرح تم میرے نقصان و خسارے میں ہی اضافہ کرو گے۔

(۳) یہ وہی اونٹنی ہے جو اللہ تعالیٰ نے ان کے کہنے پر ان کی آنکھوں کے سامنے ایک پہاڑ یا ایک چٹان سے برآمد فرمائی۔ اسی لیے اسے «نَاقَةُ اللّٰهِ» (اللہ کی اونٹنی) کہا گیا ہے کیونکہ یہ خالص اللہ کے حکم سے معجزانہ طور پر مذکورہ خلاف عادت طریقے سے ظاہر ہوئی تھی۔ اس کی بابت انہیں تاکید کر دی گئی تھی کہ اُسے ایذا نہ پہنچانا' ورنہ تم عذاب الٰہی کی گرفت میں آجاؤ گے۔

(۴) لیکن ان ظالموں نے اس زبردست معجزے کے باوجود نہ صرف ایمان لانے سے گریز کیا بلکہ حکم الٰہی سے صریح سرتابی کرتے ہوئے اسے مار ڈالا' جس کے بعد انہیں تین دن کی مہلت دے دی گئی کہ تین دن کے بعد تمہیں عذاب کے ذریعے سے ہلاک کر دیا جائے گا۔

(۵) اس سے مراد وہی عذاب ہے جو وعدے کے مطابق چوتھے دن آیا اور حضرت صالح علیہ السلام اور ان پر ایمان لانے والوں کے سوا' سب کو ہلاک کر دیا گیا۔

وَاَخَذَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوا الصَّیْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِیْ دِیَارِهِمْ جٰثِمِیْنَ ﴿۶۷﴾

اور ظالموں کو بڑے زور کی چنگھاڑ نے آدبوچا[1] پھر تو وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے ہوئے رہ گئے۔[2] (۶۷)

كَاَنْ لَّمْ یَغْنَوْا فِیْهَا ؕ اَلَاۤ اِنَّ ثَمُوْدَاۡ كَفَرُوْا رَبَّهُمْ ؕ اَلَا بُعْدًا لِّثَمُوْدَ ﴿۶۸﴾

ایسے کہ گویا وہ وہاں کبھی آباد ہی نہ تھے،[3] آگاہ رہو کہ قوم ثمود نے اپنے رب سے کفر کیا۔ سن لو! ان ثمودیوں پر پھٹکار ہے۔(۶۸)

وَلَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَاۤ اِبْرٰهِیْمَ بِالْبُشْرٰی قَالُوْا سَلٰمًا ؕ قَالَ سَلٰمٌ فَمَا لَبِثَ اَنْ جَآءَ بِعِجْلٍ حَنِیْذٍ ﴿۶۹﴾

اور ہمارے بھیجے ہوئے پیغامبر ابراہیم کے پاس خوشخبری لے کر پہنچے[4] اور سلام کہا،[5] انہوں نے بھی جواب سلام دیا[6] اور بغیر کسی تاخیر کے گائے کا بھنا ہوا بچھڑا لے آئے۔[7] (۶۹)

---

(۱) یہ عذاب صَیْحَةٌ (چیخ، زور کی کڑک) کی صورت میں آیا، بعض کے نزدیک یہ حضرت جبریل علیہ السلام کی چیخ تھی اور بعض کے نزدیک آسمان سے آئی تھی۔ جس سے ان کے دل پارہ پارہ ہو گئے اور ان کی موت واقع ہو گئی، اس کے بعد یا اس کے ساتھ ہی بھونچال (رَجْفَةٌ) بھی آیا، جس نے سب کچھ تہ و بالا کر دیا (جیسا کہ سورۂ اعراف '۷۸' میں ﴿ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ ﴾ کے الفاظ ہیں۔

(۲) جس طرح پرندہ مرنے کے بعد زمین پر مٹی کے ساتھ پڑا ہوتا ہے۔ اسی طرح یہ موت سے ہم کنار ہو کر منہ کے بل زمین پر پڑے رہے۔

(۳) ان کی بستی یا خود یہ لوگ یا دونوں ہی، اس طرح حرف غلط کی طرح مٹا دیئے گئے گویا وہ کبھی وہاں آباد ہی نہ تھے۔

(۴) یہ دراصل حضرت لوط علیہ السلام اور ان کی قوم کے قصے کا ایک حصہ ہے۔ حضرت لوط علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے چچازاد بھائی تھے۔ حضرت لوط علیہ السلام کی بستی بحیرۂ میت کے جنوب مشرق میں تھی، جبکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام فلسطین میں مقیم تھے۔ جب حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کو ہلاک کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ تو ان کی طرف فرشتے بھیجے گئے۔ یہ فرشتے قوم لوط علیہ السلام کی طرف جاتے ہوئے راستے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس ٹھہرے اور انہیں بیٹے کی بشارت دی۔

(۵) یعنی سَلَّمْنَا عَلَیْكَ سَلَامًا "ہم آپ کو سلام عرض کرتے ہیں"۔

(۶) جس طرح پہلا سلام ایک فعل مقدر کے ساتھ منصوب تھا۔ اسی طرح یہ سَلَامٌ مبتدا یا خبر ہونے کی بنا پر مرفوع ہے، عبارت ہوگی اَمْرُكُمْ سَلَامٌ یا عَلَیْكُمْ سَلَامٌ

(۷) حضرت ابراہیم علیہ السلام بڑے مہمان نواز تھے۔ وہ یہ نہیں سمجھ پائے کہ یہ فرشتے ہیں جو انسانی صورت میں آئے ہیں اور کھانے پینے سے معذور ہیں، بلکہ انہوں نے انہیں مہمان سمجھا اور فوراً مہمانوں کی خاطر تواضع کے لیے بھنا ہوا بچھڑا لا کر ان کی خدمت میں پیش کر دیا۔ نیز اس سے یہ معلوم ہوا کہ مہمان سے پوچھنے کی ضرورت نہیں بلکہ جو موجود ہو حاضر خدمت کر دیا جائے۔

فَلَمَّا رَاٰۤ اَيْدِيَهُمْ لَا تَصِلُ اِلَيْهِ نَكِرَهُمْ وَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً قَالُوْا لَا تَخَفْ اِنَّاۤ اُرْسِلْنَاۤ اِلٰى قَوْمِ لُوْطٍ ﴿٧٠﴾

اب جو دیکھا کہ ان کے تو ہاتھ بھی اس کی طرف نہیں پہنچ رہے تو ان سے اجنبیت محسوس کر کے دل ہی دل میں ان سے خوف کرنے لگے'[1] انہوں نے کہا ڈرو نہیں ہم تو قوم لوط کی طرف بھیجے ہوئے آئے ہیں۔[2] (۷۰)

وَامْرَاَتُهٗ قَآئِمَةٌ فَضَحِكَتْ فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ ﴿٧١﴾

اس کی بیوی جو کھڑی ہوئی تھی وہ ہنس پڑی'[3] تو ہم نے اسے اسحاق کی اور اسحاق کے پیچھے یعقوب کی خوشخبری دی۔(۷۱)

قَالَتْ يٰوَيْلَتٰۤى ءَاَلِدُ وَاَنَا عَجُوْزٌ وَّهٰذَا بَعْلِيْ شَيْخًا ۭ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عَجِيْبٌ ﴿٧٢﴾

وہ کہنے لگی ہائے میری کم بختی! میرے ہاں اولاد کیسے ہو سکتی ہے میں خود بڑھیا اور یہ میرے خاوند بھی بہت بڑی عمر کے ہیں یہ تو یقیناً بڑی عجیب بات ہے![4] (۷۲)

قَالُوْۤا اَتَعْجَبِيْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ رَحْمَتُ اللّٰهِ وَبَرَكٰتُهٗ عَلَيْكُمْ اَهْلَ

فرشتوں نے کہا کیا تو اللہ کی قدرت سے تعجب کر رہی[5] ہے؟ تم پر اے اس گھر کے لوگو اللہ کی رحمت

---

(۱) حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب دیکھا کہ ان کے ہاتھ کھانے کی طرف بڑھ ہی نہیں رہے' تو انہیں خوف محسوس ہوا۔ کہتے ہیں کہ ان کے ہاں یہ چیز معروف تھی کہ آئے ہوئے مہمان اگر ضیافت سے فائدہ نہ اٹھاتے تو سمجھا جاتا تھا کہ آنے والے مہمان کسی اچھی نیت سے نہیں آئے ہیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ کے پیغمبروں کو غیب کا علم نہیں ہوتا۔ اگر ابراہیم علیہ السلام غیب دان ہوتے تو بھنا ہوا بچھڑا بھی نہ لاتے اور ان سے خوف بھی محسوس نہ کرتے۔

(۲) ۔اس خوف کو فرشتوں نے محسوس کیا' یا تو ان آثار سے جو ایسے موقعوں پر انسان کے چہرے پر ظاہر ہوتے ہیں' یا اپنی گفتگو میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کا اظہار فرمایا' جیسا کہ دوسرے مقام پر وضاحت ہے ﴿اِنَّا مِنْكُمْ وَجِلُوْنَ﴾ (الحجر۔۵۲) "ہمیں تو تم سے ڈر لگتا ہے"۔ چنانچہ فرشتوں نے کہا ڈرو نہیں' آپ جو سمجھ رہے ہیں' ہم وہ نہیں ہیں' بلکہ اللہ کی طرف سے بھیجے گئے ہیں اور ہم قوم لوط علیہ السلام کی طرف جا رہے ہیں۔

(۳) حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اہلیہ کیوں ہنسیں؟ بعض کہتے ہیں کہ قوم لوط علیہ السلام کی فساد انگیزیوں سے وہ بھی آگاہ تھیں' ان کی ہلاکت کی خبر سے انہوں نے مسرت محسوس کی۔ بعض کہتے ہیں اس لیے ہنسی آئی کہ دیکھو آسمانوں سے ان کی ہلاکت کا فیصلہ ہو چکا ہے اور یہ قوم غفلت کا شکار ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ تقدیم و تاخیر ہے۔ اور اس ہنسنے کا تعلق اس بشارت سے ہے جو فرشتوں نے اس بوڑھے جوڑے کو دی۔ واللہ اعلم۔

(۴) یہ اہلیہ حضرت سارہ تھیں' جو خود بھی بوڑھی تھیں اور ان کے شوہر حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی بوڑھے تھے' اس لیے تعجب ایک فطری امر تھا' جس کا اظہار ان سے ہوا۔

(۵) یہ استفہام انکار کے لیے ہے۔ یعنی تو اللہ تعالیٰ کے قضا و قدر پر کس طرح تعجب کا اظہار کرتی ہے جبکہ اس کے لیے کوئی چیز

الْبَيْتِ ۭ اِنَّهٗ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ ۝۷۳

اور اس کی برکتیں نازل ہوں'[1] بیشک اللہ حمد و ثنا کا سزاوار اور بڑی شان والا ہے۔(۷۳)

فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ اِبْرٰهِيْمَ الرَّوْعُ وَجَاۗءَتْهُ الْبُشْرٰي يُجَادِلُنَا فِيْ قَوْمِ لُوْطٍ ۝۷۴

جب ابراہیم کا ڈر خوف جاتا رہا اور اسے بشارت بھی پہنچ چکی تو ہم سے قوم لوط کے بارے میں کہنے سننے لگے۔[2] (۷۴)

اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَحَلِيْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيْبٌ ۝۷۵

یقیناً ابراہیم بہت تحمل والے نرم دل اور اللہ کی جانب جھکنے والے تھے۔(۷۵)

يٰٓـاِبْرٰهِيْمُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ۚ اِنَّهٗ قَدْ جَاۗءَ اَمْرُ رَبِّكَ ۚ وَاِنَّهُمْ اٰتِيْهِمْ عَذَابٌ غَيْرُ مَرْدُوْدٍ ۝۷۶

اے ابراہیم! اس خیال کو چھوڑ دیجئے' آپ کے رب کا حکم آپہنچا ہے' اور ان پر نہ ٹالے جانے والا عذاب ضرور آنے والا ہے۔[3] (۷۶)

وَلَمَّا جَاۗءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا سِيْۗءَ بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا وَّقَالَ هٰذَا يَوْمٌ عَصِيْبٌ ۝۷۷

جب ہمارے بھیجے ہوئے فرشتے لوط کے پاس پہنچے تو وہ ان کی وجہ سے بہت غمگین ہو گئے اور دل ہی دل میں کڑھنے لگے اور کہنے لگے کہ آج کا دن بڑی مصیبت کا دن[4] ہے۔(۷۷)

مشکل نہیں۔اور نہ وہ اسباب عادیہ ہی کا محتاج ہے' وہ تو جو چاہے' اس کے لفظ کُنْ (ہو جا) سے معرض وجود میں آجاتا ہے۔

(۱) حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اہلیہ محترمہ کو یہاں فرشتوں نے "اہل بیت" سے یاد کیا اور دوسرے ان کے لیے جمع مذکر مخاطب (عَلَيْكُمْ) کا صیغہ استعمال کیا۔جس سے ایک بات تو یہ ثابت ہو گئی کہ "اہل بیت" میں سب سے پہلے انسان کی بیوی شامل ہوتی ہے۔دوسری' یہ کہ "اہل بیت" کے لیے جمع مذکر کے صیغے کا استعمال بھی جائز ہے۔جیسا کہ سورۂ اَحزاب' ۳۳ میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کو بھی اہل بیت کہا ہے اور انہیں جمع مذکر کے صیغے سے مخاطب بھی کیا ہے۔

(۲) اس مجادلے سے مراد یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرشتوں سے کہا کہ جس بستی کو تم ہلاک کرنے جا رہے ہو' اسی میں حضرت لوط علیہ السلام بھی موجود ہیں۔جس پر فرشتوں نے کہا "ہم جانتے ہیں کہ لوط علیہ السلام بھی وہاں رہتے ہیں۔لیکن ہم ان کو اور ان کے گھر والوں کو سوائے ان کی بیوی کے بچالیں گے"۔(العنکبوت-۳۲)

(۳) یہ فرشتوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کہا کہ اب اس بحث و تکرار کا کوئی فائدہ نہیں' اسے چھوڑیئے! اللہ کا وہ حکم (ہلاکت کا) آچکا ہے' جو اللہ کے ہاں مقدر تھا۔اور اب یہ عذاب نہ کسی کے مجادلے سے رکے گا نہ کسی کی دعا سے ٹلے گا۔

(۴) حضرت لوط علیہ السلام کی اس سخت پریشانی کی وجہ مفسرین نے یہ لکھی ہے کہ یہ فرشتے نوعمر نوجوانوں کی شکل میں آئے تھے' جو بے ریش تھے' جس سے حضرت لوط علیہ السلام نے اپنی قوم کی عادت قبیحہ کے پیش نظر سخت خطرہ محسوس

وَجَآءَهٗ قَوْمُهٗ يُهْرَعُوْنَ اِلَيْهِ ۭ وَمِنْ قَبْلُ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ السَّـيِّاٰتِ ۭ قَالَ يٰقَوْمِ هٰٓؤُلَاۗءِ بَنَاتِيْ هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ فِيْ ضَيْفِيْ ۭ اَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِيْدٌ ۷۸

اور اس کی قوم دوڑتی ہوئی اس کے پاس آ پہنچی، وہ تو پہلے ہی سے بدکاریوں میں مبتلا تھی،(۱) لوط علیہ السلام نے کہا اے قوم کے لوگو! یہ ہیں میری بیٹیاں جو تمہارے لیے بہت ہی پاکیزہ ہیں،(۲) اللہ سے ڈرو اور مجھے میرے مہمانوں کے بارے میں رسوا نہ کرو۔ کیا تم میں ایک بھی بھلا آدمی نہیں۔(۳) (۷۸)

قَالُوْا لَقَدْ عَلِمْتَ مَا لَنَا فِيْ بَنٰتِكَ مِنْ حَقٍّ ۚ وَاِنَّكَ لَتَعْلَمُ مَا نُرِيْدُ ۷۹

انہوں نے جواب دیا کہ تو بخوبی جانتا ہے کہ ہمیں تو تیری بیٹیوں پر کوئی حق نہیں ہے اور تو ہماری اصلی چاہت سے بخوبی واقف ہے۔(۴) (۷۹)

قَالَ لَوْ اَنَّ لِيْ بِكُمْ قُوَّةً اَوْ اٰوِيْٓ اِلٰى رُكْنٍ شَدِيْدٍ ۸۰

لوط علیہ السلام نے کہا کاش کہ مجھ میں تم سے مقابلہ کرنے

کیا۔ کیونکہ ان کو یہ پتہ نہیں تھا کہ آنے والے یہ نوجوان، مہمان نہیں ہیں، بلکہ اللہ کے بھیجے ہوئے فرشتے ہیں جو اس قوم کو ہلاک کرنے کے لیے ہی آئے ہیں۔

(۱) جب اغلام بازی کے ان مریضوں کو پتہ چلا کہ چند خوبرو نوجوان لوط علیہ السلام کے گھر آئے ہیں تو دوڑے ہوئے آئے اور انہیں اپنے ساتھ لے جانے پر اصرار کیا، تاکہ ان سے اپنی غلط خواہشات پوری کریں۔

(۲) یعنی تمہیں اگر جنسی خواہش ہی کی تسکین مقصود ہے تو اس کے لیے میری اپنی بیٹیاں موجود ہیں، جن سے تم نکاح کر لو اور اپنا مقصد پورا کر لو۔ یہ تمہارے لیے ہر طرح سے بہتر ہے۔ بعض نے کہا کہ بنات سے مراد عام عورتیں ہیں اور انہیں اپنی لڑکیاں اس لیے کہا ہے کہ پیغمبر اپنی امت کے لیے بمنزلہ باپ ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس کام کے لیے عورتیں موجود ہیں، ان سے نکاح کرو اور اپنا مقصد پورا کرو! (ابن کثیر)

(۳) یعنی میرے گھر آئے مہمانوں کے ساتھ زیادتی اور زبردستی کر کے مجھے رسوا نہ کرو۔ کیا تم میں ایک آدمی بھی ایسا سمجھدار نہیں ہے، جو میزبانی کے تقاضوں اور اس کی نزاکت کو سمجھ سکے؟ اور تمہیں اپنے برے ارادوں سے روک سکے؟ حضرت لوط علیہ السلام نے یہ ساری باتیں اس بنیاد پر کہیں کہ وہ ان فرشتوں کو فی الواقع نووارد مسافر اور مہمان ہی سمجھتے رہے۔ اس لیے وہ بجا طور پر ان کی حفاظت کو اپنی عزت و وقار کے لیے ضروری سمجھتے رہے۔ اگر ان کو پتہ چل جاتا یا وہ عالم الغیب ہوتے، تو ظاہر بات ہے کہ انہیں یہ پریشانی ہرگز لاحق نہ ہوتی، جو انہیں ہوئی اور جس کا نقشہ یہاں قرآن مجید نے کھینچا ہے۔

(۴) یعنی ایک جائز اور فطری طریقے کو انہوں نے بالکل رد کر دیا اور غیر فطری کام اور بے حیائی پر اصرار کیا، جس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ قوم اپنی اس بے حیائی کی عادت خبیثہ میں کتنی آگے جا چکی تھی اور کس قدر اندھی ہو گئی تھی۔

کی قوت ہوتی یا میں کسی زبردست کا آسرا پکڑ پاتا۔[1] (۸۰)

قَالُوْا يٰلُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنْ يَّصِلُوْٓا اِلَيْكَ فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ اِلَّا امْرَاَتَكَ ۭ اِنَّهٗ مُصِيْبُهَا مَآ اَصَابَهُمْ ۭ اِنَّ مَوْعِدَهُمُ الصُّبْحُ ۭ اَلَيْسَ الصُّبْحُ بِقَرِيْبٍ ۝

اب فرشتوں نے کہا اے لوط! ہم تیرے پروردگار کے بھیجے ہوئے ہیں ناممکن ہے کہ یہ تجھ تک پہنچ جائیں پس تو اپنے گھر والوں کو لے کر کچھ رات رہے نکل کھڑا ہو۔ تم میں سے کسی کو مڑ کر بھی نہ دیکھنا چاہیے' بجز تیری بیوی کے' اس لیے کہ اسے بھی وہی پہنچنے والا ہے جو ان سب کو پہنچے گا' یقیناً ان کے وعدے کا وقت صبح کا ہے' کیا صبح بالکل قریب نہیں۔[2] (۸۱)

فَلَمَّا جَاۗءَ اَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ ڏ مَّنْضُوْدٍ ۝

پھر جب ہمارا حکم آپہنچا' ہم نے اس بستی کو زیروزبر کر دیا اوپر کا حصہ نیچے کر دیا اور ان پر کنکریلے پتھر برسائے جو تہ بہ تہ تھے۔ (۸۲)

مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ ۭ وَمَا هِيَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ بِبَعِيْدٍ ۝

تیرے رب کی طرف سے نشان دار تھے اور وہ ان ظالموں سے کچھ بھی دور نہ تھے۔[3] (۸۳)

---

(۱) قوت سے اپنے دست و بازو اور اپنے وسائل کی قوت یا اولاد کی قوت مراد ہے اور رکن شدید (مضبوط آسرا) سے خاندان' قبیلہ یا اسی قسم کا کوئی مضبوط سہارا مراد ہے۔ یعنی نہایت بے بسی کے عالم میں آرزو کر رہے ہیں کہ کاش! میرے اپنے پاس کوئی قوت ہوتی یا کسی خاندان اور قبیلے کی پناہ اور مدد مجھے حاصل ہوتی تو آج مجھے مہمانوں کی وجہ سے یہ ذلت و رسوائی نہ ہوتی' میں ان بد تماشوں سے نمٹ لیتا اور مہمانوں کی حفاظت کر لیتا۔ حضرت لوط علیہ السلام کی یہ آرزو' اللہ تعالیٰ پر توکل کے منافی نہیں ہے۔ بلکہ ظاہری اسباب کے مطابق ہے۔ اور توکل علی اللہ کا صحیح مفہوم و مطلب بھی یہی ہے کہ پہلے تمام ظاہری اسباب و وسائل بروئے کار لائے جائیں اور پھر اللہ پر توکل کیا جائے۔ یہ توکل کا نہایت غلط مفہوم ہے کہ ہاتھ پیر توڑ کر بیٹھ جاؤ اور کہو کہ ہمارا بھروسہ اللہ پر ہے۔ اس لیے حضرت لوط علیہ السلام نے جو کچھ کہا' ظاہری اسباب کے اعتبار سے بالکل بجا کہا۔ جس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ اللہ کا پیغمبر جس طرح عالم الغیب نہیں ہوتا' اسی طرح وہ مختار کل بھی نہیں ہوتا' (جیسا کہ آج کل لوگوں نے یہ عقیدہ گھڑ لیا ہے) اگر نبی دنیا میں اختیارات سے بہرہ ور ہوتے تو یقیناً حضرت لوط علیہ السلام اپنی بے بسی کا اور اس آرزو کا اظہار نہ کرتے جو انہوں نے مذکورہ الفاظ میں کیا۔

(۲) جب فرشتوں نے حضرت لوط علیہ السلام کی بے بسی اور ان کی قوم کی سرکشی کا مشاہدہ کر لیا تو بولے' اے لوط! گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے' ہم تک تو کیا' اب یہ تجھ تک بھی نہیں پہنچ سکتے۔ اب رات کے ایک حصے میں' سوائے بیوی کے' اپنے گھر والوں کو لے کر یہاں سے نکل جا! صبح ہوتے ہی اس بستی کو ہلاک کر دیا جائے گا۔

(۳) اس آیت میں هِيَ کا مرجع بعض مفسرین کے نزدیک وہ نشان زدہ کنکریلے پتھر ہیں جو ان پر برسائے گئے اور بعض

وَإِلَىٰ مَدْيَنَ أَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۚ قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ ۖ وَلَا تَنقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيزَانَ ۚ إِنِّي أَرَاكُم بِخَيْرٍ وَإِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ مُّحِيطٍ ﴿٨٤﴾

اور ہم نے مدین والوں[1] کی طرف ان کے بھائی شعیب کو بھیجا' اس نے کہا اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں اور تم ناپ تول میں بھی کمی نہ کرو[2] میں تو تمہیں آسودہ حال دیکھ رہا ہوں[3] اور مجھے تم پر گھیرنے والے دن کے عذاب کا خوف (بھی) ہے۔[4] (۸۴)

وَيَا قَوْمِ أَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيزَانَ بِالْقِسْطِ ۖ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ﴿٨٥﴾

اے میری قوم! ناپ تول انصاف کے ساتھ پوری پوری کرو لوگوں کو ان کی چیزیں کم نہ دو[5] اور زمین میں فساد

کے نزدیک اس کا مرجع وہ بستیاں ہیں جو ہلاک کی گئیں اور جو شام اور مدینہ کے درمیان تھیں اور ظالمین سے مراد مشرکین مکہ اور دیگر مکذبین ہیں۔ مقصد ان کو ڈرانا ہے کہ تمہارا حشر بھی ویسا ہو سکتا ہے جس سے گزشتہ قومیں دوچار ہوئیں۔

(۱) مدین کی تحقیق کے لیے دیکھئے سورۃ الأعراف' آیت ۸۵ کا حاشیہ۔

(۲) توحید کی دعوت دینے کے بعد' اس قوم میں جو نمایاں اخلاقی خرابی۔ ناپ تول میں کمی۔ کی تھی' اس سے انہیں منع فرمایا۔ ان کا معمول یہ بن چکا تھا کہ جب ان کے پاس فروخت کنندہ (بائع) اپنی چیز لے کر آتا تو اس سے ناپ اور تول میں زائد چیز لیتے اور جب خریدار (مشتری) کو کوئی چیز فروخت کرتے تو ناپ میں بھی کمی کر کے دیتے اور تول میں بھی ڈنڈی مار لیتے۔

(۳) یہ اس منع کرنے کی علت ہے کہ جب اللہ تعالیٰ تم پر اپنا فضل کر رہا ہے اور اس نے تمہیں آسودگی اور مال و دولت سے نوازا ہے تو پھر تم یہ قبیح حرکت کیوں کرتے ہو؟

(۴) یہ دوسری علت ہے کہ اگر تم اپنی اس حرکت سے باز نہ آئے تو پھر اندیشہ ہے کہ قیامت والے دن کے عذاب سے تم نہ بچ سکو۔ گھیرنے والے دن سے مراد قیامت کا دن ہے کہ اس دن کوئی گناہ گار مؤاخذہ الٰہی سے بچ سکے گا نہ بھاگ کر کہیں چھپ سکے گا۔

(۵) انبیا علیہم السلام کی دعوت دو اہم بنیادوں پر مشتمل ہوتی ہے ۱۔ حقوق اللہ کی ادائیگی ۲۔ حقوق العباد کی ادائیگی۔ اول الذکر کی طرف لفظ ﴿اعْبُدُوا اللَّهَ﴾ اور آخر الذکر کی جانب ﴿وَلَا تَنقُصُوا الْمِكْيَالَ﴾ سے اشارہ کیا گیا اور اب تاکید کے طور پر انہیں انصاف کے ساتھ پورا پورا ناپ تول کا حکم دیا جا رہا ہے اور لوگوں کو چیزیں کم کر کے دینے سے منع کیا جا رہا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ہاں یہ بھی ایک بہت بڑا جرم ہے اور اللہ تعالیٰ نے ایک پوری سورت میں اس جرم کی شناعت و قباحت اور اس کی اخروی سزا بیان فرمائی ہے۔ ﴿وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِينَ * الَّذِينَ إِذَا اكْتَالُوا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُونَ * وَإِذَا كَالُوهُمْ أَو وَّزَنُوهُمْ يُخْسِرُونَ﴾ (سورۃ المطففین ۱-۳) "مطففین کے لیے ہلاکت ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ جب لوگوں سے ناپ کر لیتے ہیں تو پورا لیتے ہیں اور جب دوسروں کو ناپ کر یا تول کر دیتے ہیں' تو کم کر کے دیتے ہیں۔"

اور خرابی نہ مچاؤ۔ (۱) (۸۵)

بَقِيَّتُ اللّٰهِ خَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِينَ ۚ وَمَآ أَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيظٍ ﴿٨٦﴾

اللہ تعالیٰ کا حلال کیا ہوا جو بچ رہے تمہارے لیے بہت ہی بہتر ہے اگر تم ایمان والے ہو' (۲) میں تم پر کچھ نگہبان (اور داروغہ) نہیں ہوں۔ (۳) (۸۶)

قَالُوا يٰشُعَيْبُ أَصَلٰوتُكَ تَأْمُرُكَ أَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ آبَآؤُنَآ أَوْ أَنْ نَّفْعَلَ فِيٓ أَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا ۖ إِنَّكَ لَأَنْتَ الْحَلِيمُ الرَّشِيدُ ﴿٨٧﴾

انہوں نے جواب دیا کہ اے شعیب! کیا تیری صلاۃ (۴) تجھے یہی حکم دیتی ہے کہ ہم اپنے باپ دادوں کے معبودوں کو چھوڑ دیں اور ہم اپنے مالوں میں جو کچھ چاہیں اس کا کرنا بھی چھوڑ دیں (۵) تو تو بڑا ہی باوقار اور نیک چلن آدمی ہے۔ (۶) (۸۷)

قَالَ يٰقَوْمِ أَرَءَيْتُمْ إِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّي وَرَزَقَنِي مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا ۚ وَمَآ أُرِيدُ أَنْ أُخَالِفَكُمْ إِلٰى مَآ

کہا اے میری قوم! دیکھو تو اگر میں اپنے رب کی طرف سے روشن دلیل لیے ہوئے ہوں اور اس نے مجھے اپنے پاس سے بہترین روزی دے رکھی ہے' (۷) میرا یہ ارادہ

(۱) اللہ کی نافرمانی سے' بالخصوص جن کا تعلق حقوق العباد سے ہو' جیسے یہاں ناپ تول کی کمی بیشی میں ہے' زمین میں یقیناً فساد اور بگاڑ پیدا ہوتا ہے جس سے انہیں منع کیا گیا۔

(۲) ﴿بَقِيَّتُ اللّٰهِ﴾ سے مراد' وہ نفع ہے جو ناپ تول میں کسی قسم کی کمی کیے بغیر' دیانت داری کے ساتھ سودا دینے کے بعد حاصل ہو۔ یہ چونکہ حلال و طیب ہے اور خیروبرکت بھی اسی میں ہے' اس لیے اللہ کا بقیہ قرار دیا گیا ہے۔

(۳) یعنی میں تمہیں صرف تبلیغ کر سکتا ہوں اور وہ اللہ کے حکم سے کر رہا ہوں۔ لیکن برائیوں سے میں تمہیں روک دوں یا اس پر سزا دوں' یہ میرے اختیار میں نہیں ہے۔ ان دونوں باتوں کا اختیار صرف اللہ کے پاس ہے۔

(۴) صَلٰوةٌ سے مراد' عبادت' دین یا تلاوت ہے۔

(۵) اس سے مراد بعض مفسرین کے نزدیک زکوٰۃ و صدقات ہیں جس کا حکم ہر آسمانی مذہب میں دیا گیا ہے۔ اللہ کے حکم سے زکوٰۃ و صدقات کا اخراج' اللہ کے نافرمانوں پر نہایت شاق گزرتا ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ جب ہم اپنی محنت و لیاقت سے مال کماتے ہیں تو اس کے خرچ کرنے یا نہ کرنے میں ہم پر پابندی کیوں ہو؟ اور اس کا کچھ حصہ ایک مخصوص مد کے لیے نکالنے پر ہمیں مجبور کیوں کیا جائے؟ اسی طریقے سے کمائی اور تجارت میں حلال و حرام اور جائز و ناجائز کی پابندی بھی ایسے لوگوں پر نہایت گراں گزرتی ہے' ممکن ہے ناپ تول میں کمی سے روکنے کو بھی انہوں نے اپنے مالی تصرفات میں دخل در معقولات سمجھا ہو۔ اور ان الفاظ میں اس سے انکار کیا ہو۔ دونوں ہی مفہوم اس کے صحیح ہیں۔

(۶) حضرت شعیب علیہ السلام کے لیے یہ الفاظ انہوں نے بطور استہزا کہے۔

(۷) رزق حسن کا دوسرا مفہوم نبوت بھی بیان کیا گیا ہے۔ (ابن کثیر)

أَنْهَاكُمْ عَنْهُ ۚ إِنْ أُرِيدُ إِلَّا الْإِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ۚ وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ ۚ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ ﴿٨٨﴾

بالکل نہیں کہ تمہارا خلاف کر کے خود اس چیز کی طرف جھک جاؤں جس سے تمہیں روک رہا ہوں'[1] میرا ارادہ تو اپنی طاقت بھر اصلاح کرنے کا ہی ہے۔[2] میری توفیق اللہ ہی کی مدد سے ہے'[3] اسی پر میرا بھروسہ ہے اور اسی کی طرف میں رجوع کرتا ہوں۔(۸۸)

وَيَا قَوْمِ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شِقَاقِي أَنْ يُصِيبَكُمْ مِثْلُ مَا أَصَابَ قَوْمَ نُوحٍ أَوْ قَوْمَ هُودٍ أَوْ قَوْمَ صَالِحٍ ۚ وَمَا قَوْمُ لُوطٍ مِنْكُمْ بِبَعِيدٍ ﴿٨٩﴾

اور اے میری قوم (کے لوگو!) کہیں ایسا نہ ہو کہ تم کو میری مخالفت ان عذابوں کا مستحق بنا دے جو قوم نوح اور قوم ہود اور قوم صالح کو پہنچے ہیں۔ اور قوم لوط تو تم سے کچھ دور نہیں۔[4] (۸۹)

وَاسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوبُوا إِلَيْهِ ۚ إِنَّ رَبِّي رَحِيمٌ وَدُودٌ ﴿٩٠﴾

تم اپنے رب سے استغفار کرو اور اس کی طرف توبہ کرو' یقین مانو کہ میرا رب بڑی مہربانی والا اور بہت محبت کرنے والا ہے۔(۹۰)

قَالُوا يَا شُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِيرًا مِمَّا تَقُولُ وَإِنَّا لَنَرَاكَ فِينَا ضَعِيفًا ۖ وَلَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنَاكَ ۖ وَمَا أَنْتَ عَلَيْنَا بِعَزِيزٍ ﴿٩١﴾

انہوں نے کہا اے شعیب! تیری اکثر باتیں تو ہماری سمجھ میں ہی نہیں آتیں[5] اور ہم تو تجھے اپنے اندر بہت کمزور پاتے ہیں'[6] اگر تیرے قبیلے کا خیال نہ ہوتا تو ہم تو تجھے سنگسار کر دیتے'[7] اور ہم تجھے کوئی حیثیت والی ہستی

(۱) یعنی جس کام سے میں تمہیں روکوں' تم سے خلاف ہو کر' وہ میں خود کروں' ایسا نہیں ہو سکتا۔

(۲) میں تمہیں جس کام کے کرنے یا جس سے رکنے کا حکم دیتا ہوں' اس سے مقصد اپنی مقدور بھر' تمہاری اصلاح ہی ہے۔

(۳) یعنی حق تک پہنچنے کا جو میرا ارادہ ہے' وہ اللہ کی توفیق سے ہی ممکن ہے' اس لیے تمام معاملات میں میرا بھروسہ اسی پر ہے اور اسی کی طرف میں رجوع کرتا ہوں۔

(۴) یعنی ان کی جگہ تم سے دور نہیں' یا اس سبب میں تم سے دور نہیں جو ان کے عذاب کا موجب بنا۔

(۵) یہ یا تو انہوں نے بطور مذاق اور تحقیر کہا دراں حالیکہ ان کی باتیں ان کے لیے ناقابل فہم نہیں تھیں۔ اس صورت میں یہاں فہم کی نفی مجازاً ہو گی۔ یا ان کا مقصد ان باتوں کے سمجھنے سے معذوری کا اظہار ہے جن کا تعلق غیب سے ہے۔ مثلاً بعث بعد الموت' حشر نشر' جنت و دوزخ وغیرہ اس لحاظ سے' فہم کی نفی حقیقتاً ہو گی۔

(۶) یہ کمزوری جسمانی لحاظ سے تھی' جیسا کہ بعض کا خیال ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام کی بینائی کمزور تھی یا وہ نحیف ولاغر جسم کے تھے یا اس اعتبار سے انہیں کمزور کہا کہ وہ خود بھی مخالفین سے تنہا مقابلہ کرنے کی سکت نہیں رکھتے تھے۔

(۷) حضرت شعیب علیہ السلام کا قبیلہ کہا جاتا ہے کہ ان کا پشتیبان نہیں تھا' لیکن وہ قبیلہ چونکہ کفر و شرک میں اپنی ہی

نہیں گنتے۔ [۱] (۹۱)

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَهْطِيْٓ اَعَزُّ عَلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَاتَّخَذْتُمُوْهُ وَرَاۗءَكُمْ ظِهْرِيًّا ۭ اِنَّ رَبِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ۹۲

انہوں نے جواب دیا کہ اے میری قوم کے لوگو! کیا تمہارے نزدیک میرے قبیلے کے لوگ اللہ سے بھی زیادہ ذی عزت ہیں کہ تم نے اسے پس پشت ڈال [۲] دیا ہے یقیناً میرا رب جو کچھ تم کر رہے ہو سب کو گھیرے ہوئے ہے۔ (۹۲)

وَيٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰي مَكَانَتِكُمْ اِنِّىْ عَامِلٌ ۭ سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَمَنْ هُوَ كَاذِبٌ ۭ وَارْتَقِبُوْٓا اِنِّىْ مَعَكُمْ رَقِيْبٌ ۹۳

اے میری قوم کے لوگو! اب تم اپنی جگہ عمل کیے جاؤ میں بھی عمل کر رہا ہوں، تمہیں عنقریب معلوم ہو جائے گا کہ کس کے پاس وہ عذاب آتا ہے جو اسے رسوا کر دے اور کون ہے جو جھوٹا ہے۔ تم انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ منتظر ہوں۔ [۳] (۹۳)

وَلَمَّا جَاۗءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا شُعَيْبًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَاَخَذَتِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا

جب ہمارا حکم (عذاب) آپہنچا ہم نے شعیب کو اور ان کے ساتھ (تمام) مومنوں کو اپنی خاص رحمت سے نجات بخشی اور ظالموں کو سخت چنگھاڑ کے عذاب

قوم کے ساتھ تھا، اس لیے اپنے ہم مذہب ہونے کی وجہ سے اس قبیلے کا لحاظ، بہرحال حضرت شعیب علیہ السلام کے ساتھ سخت رویہ اختیار کرنے اور انہیں نقصان پہنچانے میں مانع تھا۔

(۱) لیکن چونکہ تیرے قبیلے کی حیثیت بہرحال ہمارے دلوں میں موجود ہے، اس لیے ہم درگزر سے کام لے رہے ہیں۔

(۲) کہ تم مجھے تو میرے قبیلے کی وجہ سے نظرانداز کر رہے ہو۔ لیکن جس اللہ نے مجھے منصب نبوت سے نوازا ہے، اس کی کوئی عظمت اور اس منصب کا کوئی احترام تمہارے دلوں میں نہیں ہے اور اسے تم نے پس پشت ڈال دیا ہے۔ یہاں حضرت شعیب علیہ السلام نے أَعَزُّ عَلَيْكُمْ مِنِّي (مجھ سے زیادہ ذی عزت) کی بجائے ﴿اَعَزُّ عَلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ﴾ (اللہ سے زیادہ ذی عزت) کہا، جس سے یہ بتلانا مقصود ہے کہ نبی کی توہین، یہ دراصل اللہ کی توہین ہے۔ اس لیے کہ نبی اللہ کا مبعوث ہوتا ہے۔ اور اسی اعتبار سے اب علمائے حق کی توہین اور ان کو حقیر سمجھنا یہ اللہ کے دین کی توہین اور اس کا استخفاف ہے، اس لیے کہ وہ اللہ کے دین کے نمائندے ہیں۔ وَاتَّخَذْتُمُوْهُ میں ھا کا مرجع اللہ ہے اور مطلب یہ ہے کہ اللہ کے اس معاملے کو، جسے لے کر اس نے مجھے بھیجا ہے، اسے تم نے پس پشت ڈال دیا ہے اور اس کی کوئی پروا تم نے نہیں کی۔

(۳) جب انہوں نے دیکھا کہ یہ قوم اپنے کفر و شرک پر مصر ہے اور وعظ و نصیحت کا بھی کوئی اثر ان پر نہیں ہو رہا، تو کہا اچھا تم اپنی ڈگر پر چلتے رہو، عنقریب تمہیں جھوٹے سچے کا اور اس بات کا کہ رسوا کن عذاب کا مستحق کون ہے؟ علم ہو جائے گا۔

دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿٩٤﴾

نے دھر دبوچا[1] جس سے وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے ہوئے ہو گئے۔ (۹۴)

كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ؕ اَلَا بُعْدًا لِّمَدْيَنَ كَمَا بَعِدَتْ ثَمُوْدُ ﴿٩٥﴾

گویا کہ وہ ان گھروں میں کبھی بسے ہی نہ تھے' آگاہ رہو مدین کے لیے بھی ویسی ہی دوری[2] ہو جیسی دوری ثمود کو ہوئی۔ (۹۵)

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿٩٦﴾

اور یقیناً ہم نے ہی موسیٰ کو اپنی آیات اور روشن دلیلوں کے ساتھ بھیجا تھا۔[3] (۹۶)

اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ فِرْعَوْنَ ۚ وَمَآ اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِيْدٍ ﴿٩٧﴾

فرعون اور اس کے سرداروں[4] کی طرف' پھر بھی ان لوگوں نے فرعون کے احکام کی پیروی کی اور فرعون کا کوئی حکم درست تھا ہی نہیں۔[5] (۹۷)

يَقْدُمُ قَوْمَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ ؕ وَبِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ ﴿٩٨﴾

وہ تو قیامت کے دن اپنی قوم کا پیش رو ہو کر ان سب کو دوزخ میں جا کھڑا کرے گا'[6] وہ بہت ہی برا گھاٹ[7] ہے جس پر لا کھڑے کیے جائیں گے۔ (۹۸)

---

(۱) اس چیخ سے ان کے دل پارہ پارہ ہو گئے اور ان کی موت واقع ہو گئی اور اس کے معاً بعد ہی بھونچال بھی آیا' جیسا کہ سورۂ اعراف-۹۱- اور سورۂ عنکبوت ۳۷ میں ہے۔

(۲) یعنی لعنت' پھٹکار' اللہ کی رحمت سے محرومی اور دوری۔

(۳) آیاتٌ سے بعض کے نزدیک تورات اور سلطان مبین سے معجزات مراد ہیں۔ اور بعض کہتے ہیں کہ آیات سے' آیات تسعہ اور سلطان مبین (روشن دلیل) سے عصا مراد ہے۔ عصا' اگرچہ آیات تسعہ میں شامل ہے لیکن یہ معجزہ چونکہ نہایت ہی عظیم الشان تھا' اس لیے اس کا خصوصی طور پر ذکر کیا گیا ہے۔

(۴) مَلَاءٌ قوم کے اشراف اور ممتاز قسم کے لوگوں کو کہا جاتا ہے۔ (اس کی تشریح پہلے گزر چکی ہے) فرعون کے ساتھ' اس کے دربار کے ممتاز لوگوں کا نام اس لیے لیا گیا ہے کہ اشراف قوم ہی ہر معاملے کے ذمے دار ہوتے تھے اور قوم ان ہی کے پیچھے چلتی تھی۔ اگر یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آتے تو یقیناً فرعون کی ساری قوم ایمان لے آتی۔

(۵) رَشِيْدٌ' ذی رشد کے معنی میں ہے۔ یعنی بات تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی رشد وہدایت والی تھی' لیکن اسے ان لوگوں نے رد کر دیا اور فرعون کی بات' جو رشد وہدایت سے دور تھی' اس کی انہوں نے پیروی کی۔

(۶) یعنی فرعون' جس طرح دنیا میں ان کا رہبر اور پیش رو تھا' قیامت والے دن بھی یہ آگے آگے ہی ہو گا اور اپنی قوم کو اپنی قیادت میں جہنم میں لے کر جائے گا۔

(۷) وِرْدٌ پانی کے گھاٹ کو کہتے ہیں' جہاں پیاسے جا کر اپنی پیاس بجھاتے ہیں۔ لیکن یہاں جہنم کو ورد کہا گیا ہے۔ مَوْرُوْدٌ وہ مقام یا

وَاُتْبِعُوْا فِيْ هٰذِهٖ لَعْنَةً وَّيَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ بِئْسَ الرِّفْدُ الْمَرْفُوْدُ ۝۹۹

ان پر تو اس دنیا میں بھی لعنت چپکا دی گئی اور قیامت کے دن بھی[1] برا انعام ہے جو دیا گیا۔[2] (۹۹)

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَاۗءِ الْقُرٰي نَقُصُّهٗ عَلَيْكَ مِنْهَا قَاۗىِٕمٌ وَّحَصِيْدٌ ۝۱۰۰

بستیوں کی یہ بعض خبریں جنہیں ہم تیرے سامنے بیان فرما رہے ہیں ان میں سے بعض تو موجود ہیں اور بعض (کی فصلیں) کٹ گئی ہیں۔[3] (۱۰۰)

وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَمَآ اَغْنَتْ عَنْهُمْ اٰلِهَتُهُمُ الَّتِيْ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ لَّمَّا جَاۗءَ اَمْرُ رَبِّكَ ۭ وَمَا زَادُوْهُمْ غَيْرَ تَتْبِيْبٍ ۝۱۰۱

ہم نے ان پر کوئی ظلم نہیں کیا[4] بلکہ خود انہوں نے ہی اپنے اوپر ظلم کیا[5] اور انہیں ان کے معبودوں نے کوئی فائدہ نہ پہنچایا جنہیں وہ اللہ کے سوا پکارا کرتے تھے' جب کہ تیرے پروردگار کا حکم آپہنچا' بلکہ اور ان کا نقصان ہی انہوں نے بڑھا دیا۔[6] (۱۰۱)

وَكَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَآ اَخَذَ الْقُرٰي وَهِىَ ظَالِمَةٌ ۭ اِنَّ اَخْذَهٗٓ اَلِيْمٌ شَدِيْدٌ ۝۱۰۲

تیرے پروردگار کی پکڑ کا یہی طریقہ ہے جب کہ وہ بستیوں کے رہنے والے ظالموں کو پکڑتا ہے بیشک اس کی پکڑ دکھ دینے والی اور نہایت[7] سخت ہے۔(۱۰۲)

گھاٹ یعنی جہنم جس میں لوگ لے جائے جائیں گے یعنی جگہ بھی بری اور جانے والے بھی برے۔ اَعَاذَنَا اللهُ مِنهَا.

(۱) لَعْنَةٌ سے پھٹکار اور رحمت الٰہی سے دوری و محرومی ہے' گویا دنیا میں بھی وہ رحمت الٰہیہ سے محروم اور آخرت میں بھی اس سے محروم ہی رہیں گے' اگر ایمان نہ لائے۔

(۲) رِفدٌ انعام اور عطیے کو کہا جاتا ہے۔ یہاں لعنت کو رفد کہا گیا ہے۔ اسی لیے اسے برا انعام قرار دیا گیا۔ مَرْفُودٌ سے مراد' وہ انعام جو کسی کو دیا جائے۔ یہ الرفد کی تاکید ہے۔

(۳) قائم' سے مراد وہ بستیاں' جو اپنی چھتوں پر قائم ہیں اور حَصِيدٌ بمعنی محصود سے مراد وہ بستیاں جو کٹی ہوئی کھیتیوں کی طرح نابود ہو گئیں۔ یعنی جن گزشتہ بستیوں کے واقعات ہم بیان کر رہے ہیں' ان میں سے بعض تو اب بھی موجود ہیں' جن کے آثار و کھنڈرات نشان عبرت ہیں اور بعض بالکل ہی صفحہ ہستی سے معدوم ہو گئیں اور ان کا وجود صرف تاریخ کے صفحات پر باقی رہ گیا ہے۔

(۴) ان کو عذاب اور ہلاکت سے دوچار کر کے۔

(۵) کفر و معاصی کا ارتکاب کر کے۔

(۶) جب کہ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ یہ انہیں نقصان سے بچائیں گے اور فائدہ پہنچائیں گے۔ لیکن جب اللہ کا عذاب آیا تو واضح ہو گیا کہ ان کا یہ عقیدہ فاسد تھا' اور یہ بات ثابت ہو گئی کہ اللہ کے سوا کوئی کسی کو نفع نقصان پہنچانے پر قادر نہیں۔

(۷) یعنی جس طرح گزشتہ بستیوں کو اللہ تعالیٰ نے تباہ و برباد کیا' آئندہ بھی وہ ظالموں کی اسی طرح گرفت کرنے پر قادر ہے۔

إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لِّمَنْ خَافَ عَذَابَ الْآخِرَةِ ۚ ذَٰلِكَ يَوْمٌ مَّجْمُوعٌ لَّهُ النَّاسُ وَذَٰلِكَ يَوْمٌ مَّشْهُودٌ ﴿١٠٣﴾

یقیناً اس میں (۱) ان لوگوں کے لیے نشان عبرت ہے جو قیامت کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔ وہ دن جس میں سب لوگ جمع کیے جائیں گے اور وہ' وہ دن ہے جس میں سب حاضر کیے جائیں گے۔ (۲) (۱۰۳)

وَمَا نُؤَخِّرُهُ إِلَّا لِأَجَلٍ مَّعْدُودٍ ﴿١٠٤﴾

اسے ہم جو ملتوی کرتے ہیں وہ صرف ایک مدت معین تک ہے۔ (۳) (۱۰۴)

يَوْمَ يَأْتِ لَا تَكَلَّمُ نَفْسٌ إِلَّا بِإِذْنِهِ ۚ فَمِنْهُمْ شَقِيٌّ وَسَعِيدٌ ﴿١٠٥﴾

جس دن وہ آجائے گی مجال نہ ہوگی کہ اللہ کی اجازت کے بغیر کوئی بات بھی کر (۴) لے' سو ان میں کوئی بدبخت ہوگا اور کوئی نیک بخت۔ (۱۰۵)

فَأَمَّا الَّذِينَ شَقُوا فَفِي النَّارِ لَهُمْ فِيهَا زَفِيرٌ وَشَهِيقٌ ﴿١٠٦﴾

لیکن جو بدبخت ہوئے وہ دوزخ میں ہوں گے وہاں چیخیں گے چلائیں گے۔ (۱۰۶)

خَالِدِينَ فِيهَا مَا دَامَتِ السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ إِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ

وہ وہیں ہمیشہ رہنے والے ہیں جب تک آسمان و زمین برقرار رہیں (۵) سوائے اس وقت کے جو تمہارا رب

حدیث میں آتا ہے' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا إِنَّ اللهَ لَيُمْلِي لِلظَّالِمِ حَتَّى إِذَا أَخَذَهُ لَمْ يُفْلِتْهُ اللہ تعالیٰ یقیناً ظالم کو مہلت دیتا ہے لیکن جب اس کی گرفت کرنے پر آتا ہے تو پھر اس طرح اچانک کرتا ہے کہ پھر مہلت نہیں دیتا"۔

(۱) یعنی مؤاخذۂ الٰہی میں یا ان واقعات میں جو عبرت و موعظت کے لیے بیان کیے گئے ہیں۔

(۲) یعنی حساب اور بدلے کے لیے۔

(۳) یعنی قیامت کے دن میں تاخیر کی وجہ صرف یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کے لیے ایک وقت معین کیا ہوا ہے۔ جب وہ وقت مقرر آجائے گا' تو ایک لمحے کی تاخیر نہیں ہوگی۔

(۴) گفتگو نہ کرنے سے مراد' کسی کو اللہ تعالیٰ سے کسی طرح کی بات یا شفاعت کرنے کی ہمت نہیں ہوگی۔ الا یہ کہ وہ اجازت دے دے۔ طویل حدیث شفاعت میں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا' وَلَا يَتَكَلَّمُ يَوْمَئِذٍ إِلَّا الرُّسُلُ وَدَعْوَى الرُّسُلِ يَوْمَئِذٍ: اللَّهُمَّ سَلِّمْ سَلِّمْ (صحيح بخاری- كتاب الإيمان' باب فضل السجود' ومسلم' كتاب الإيمان' باب معرفة طريق الرؤية) "اس دن انبیا کے علاوہ کسی کو گفتگو کی ہمت نہ ہوگی اور انبیا کی زبان پر بھی اس دن صرف یہی ہوگا کہ یا اللہ! ہمیں بچالے' ہمیں بچالے"۔

(۵) ان الفاظ سے بعض لوگوں کو یہ مغالطہ لگا ہے کہ کافروں کے لیے جہنم کا عذاب دائمی نہیں ہے بلکہ موقت ہے یعنی اس وقت تک رہے گا' جب تک آسمان و زمین رہیں گے۔ لیکن یہ بات صحیح نہیں۔ کیونکہ یہاں ﴿ مَا دَامَتِ السَّمَاوَاتُ

إِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ ﴿۱۰۷﴾

چاہے۔ (۱) یقیناً تیرا رب جو کچھ چاہے کر گزرتا ہے۔(۱۰۷)

وَأَمَّا الَّذِينَ سُعِدُوا فَفِي الْجَنَّةِ خَالِدِينَ فِيهَا مَا دَامَتِ السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ إِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ ۖ عَطَاءً غَيْرَ مَجْذُوذٍ ﴿۱۰۸﴾

لیکن جو نیک بخت کیے گئے وہ جنت میں ہوں گے جہاں ہمیشہ رہیں گے جب تک آسمان و زمین باقی رہے مگر جو تیرا پروردگار چاہے۔ (۲) یہ بے انتہا بخشش ہے۔ (۳) (۱۰۸)

وَالْأَرْضُ﴾ اہل عرب کے روزمرہ کی گفتگو اور محاورے کے مطابق نازل ہوا ہے۔ عربوں کی عادت تھی کہ جب کسی چیز کا دوام ثابت کرنا مقصود ہوتا تو وہ کہتے تھے کہ هَذَا دَائِمٌ دَوَامَ السَّمٰوَاتِ وَالأَرْضِ (یہ چیز اسی طرح ہمیشہ رہے گی جس طرح آسمان و زمین کا دوام ہے) اسی محاورے کو قرآن کریم میں استعمال کیا گیا ہے' جس کا مطلب یہ ہے کہ اہل کفر و شرک جہنم میں ہمیشہ رہیں گے جس کو قرآن نے متعدد جگہ ﴿ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ﴾ کے الفاظ سے ذکر کیا ہے۔ ایک دوسرا مفہوم اس کا یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ آسمان و زمین سے مراد' جنس ہے۔ یعنی دنیا کے آسمان و زمین اور ہیں جو فنا ہو جائیں گے لیکن آخرت کے آسمان و زمین ان کے علاوہ اور ہوں گے' جیسا کہ قرآن کریم میں اس کی صراحت ہے' ﴿ يَوْمَ تُبَدَّلُ الْأَرْضُ غَيْرَ الْأَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ ﴾ (سورۃ إبراهيم-۴۸) ''اس دن یہ زمین دوسری زمین سے بدل دی جائے گی اور آسمان بھی (بدل دیے جائیں گے)'' اور آخرت کے یہ آسمان و زمین' جنت اور دوزخ کی طرح' ہمیشہ رہیں گے۔ اس آیت میں یہی آسمان و زمین مراد ہے' نہ کہ دنیا کے آسمان و زمین' جو فنا ہو جائیں گے۔ (ابن کثیر) ان دونوں مفہوموں میں سے کوئی بھی مفہوم مراد لے لیا جائے' آیت کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے اور وہ اشکال پیدا نہیں ہوتا جو مذکور رہا۔ امام شوکانی نے اس کے اور بھی کئی مفہوم بیان کیے ہیں جنہیں اہل علم ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ (فتح القدیر)

(۱) اس استثناء کے بھی کئی مفہوم بیان کیے گئے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ صحیح مفہوم یہی ہے کہ یہ استثناء ان گناہ گاروں کے لیے ہے جو اہل توحید و اہل ایمان ہوں گے۔ اس اعتبار سے اس سے ماقبل آیت میں شَقِيٌّ کا لفظ عام یعنی کافر اور عاصی دونوں کو شامل ہوگا اور ﴿ إِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ ﴾ سے عاصی مومنوں کا استثناء ہو جائے گا۔ اور مَا شَاءَ میں مَا، مَنْ کے معنی میں ہے۔

(۲) یہ استثناء بھی عصاۃ اہل ایمان کے لیے ہے۔ یعنی دیگر جنتیوں کی طرح یہ نافرمان مومن ہمیشہ سے جنت میں نہیں رہیں ہوں گے۔ بلکہ ابتداء میں ان کا کچھ عرصہ جہنم میں گزرے گا اور پھر انبیا اور اہل ایمان کی سفارش سے ان کو جہنم سے نکال کر جنت میں داخل کیا جائے گا' جیسا کہ احادیث صحیحہ سے یہ باتیں ثابت ہیں۔

(۳) غیر مجذوذ کے معنی ہیں غیر مقطوع۔ یعنی نہ ختم ہونے والی عطاء۔ اس جملے سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ جن گناہ گاروں کو جہنم سے نکال کر جنت میں داخل کیا جائے گا' یہ دخول عارضی نہیں' ہمیشہ کے لیے ہوگا اور تمام جنتی ہمیشہ اللہ کی عطاء اور اس کی نعمتوں سے لطف اندوز ہوتے رہیں گے' اس میں کبھی انقطاع نہیں ہوگا۔

فَلَا تَكُ فِيْ مِرْيَةٍ مِّمَّا يَعْبُدُ هٰٓؤُلَآءِ ۭ مَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا كَمَا يَعْبُدُ اٰبَاۗؤُهُمْ مِّنْ قَبْلُ ۭ وَاِنَّا لَمُوَفُّوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ غَيْرَ مَنْقُوْصٍ ۝۱۰۹

اس لئے آپ ان چیزوں سے شک و شبہ میں نہ رہیں جنہیں یہ لوگ پوج رہے ہیں' ان کی پوجا تو اس طرح ہے جس طرح ان کے باپ دادوں کی اس سے پہلے تھی- ہم ان سب کو ان کا پورا پورا حصہ بغیر کسی کمی کے دینے والے ہی ہیں-[1] (۱۰۹)

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِيْهِ ۭ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ۭ وَاِنَّهُمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ ۝۱۱۰

یقیناً ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو کتاب دی- پھر اس میں اختلاف کیا گیا'[2] اگر پہلے ہی آپ کے رب کی بات صادر نہ ہو گئی ہوتی تو یقیناً ان کا فیصلہ کر دیا جاتا'[3] انہیں تو اس میں سخت شبہ ہے- (۱۱۰)

وَاِنَّ كُلًّا لَّمَّا لَيُوَفِّيَنَّهُمْ رَبُّكَ اَعْمَالَهُمْ ۭ اِنَّهٗ بِمَا يَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝۱۱۱

یقیناً ان میں سے ہر ایک جب ان کے روبرو جائے گا تو آپ کا رب اسے اس کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دے گا- بیشک وہ جو کر رہے ہیں ان سے وہ باخبر ہے- (۱۱۱)

فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا ۭ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝۱۱۲

پس آپ جمے رہیے جیسا کہ آپ کو حکم دیا گیا ہے اور وہ لوگ بھی جو آپ کے ساتھ توبہ کر چکے ہیں' خبردار تم حد سے نہ بڑھنا'[4] اللہ تمہارے تمام اعمال کا دیکھنے والا ہے- (۱۱۲)

---

(۱) اس سے مراد وہ عذاب ہے جس کے وہ مستحق ہوں گے' اس میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی-

(۲) یعنی کسی نے اس کتاب کو مانا اور کسی نے نہیں مانا- یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی جا رہی ہے کہ پچھلے انبیا کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوتا آیا ہے' کچھ لوگ ان پر ایمان لانے والے ہوتے اور دوسرے تکذیب کرنے والے- اس لیے آپ اپنی تکذیب سے نہ گھبرائیں-

(۳) اس سے مراد یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی سے ان کے لیے عذاب کا ایک وقت مقرر کیا ہوا نہ ہوتا تو وہ انہیں فوراً ہلاک کر ڈالتا-

(۴) اس آیت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل ایمان کو ایک تو استقامت کی تلقین کی جا رہی ہے' جو دشمن کے مقابلے کے لیے ایک بہت بڑا ہتھیار ہے- دوسرے طُغْیَانٌ یعنی بَغْیٌ (حد سے بڑھ جانے) سے روکا گیا ہے' جو اہل ایمان کی اخلاقی قوت اور رفعت کردار کے لیے بہت ضروری ہے- حتیٰ کہ یہ تجاوز' دشمن کے ساتھ معاملہ کرتے وقت بھی جائز نہیں ہے-

وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ ۙ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ﴿۱۱۳﴾

دیکھو ظالموں کی طرف ہرگز نہ جھکنا ورنہ تمہیں بھی (دوزخ کی) آگ لگ جائے گی [1] اور اللہ کے سوا اور تمہارا مددگار نہ کھڑا ہو سکے گا اور نہ تم مدد دیے جاؤ گے۔ (۱۱۳)

وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ ۭ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّـيِّاٰتِ ۭ ذٰلِكَ ذِكْرٰي لِلذّٰكِرِيْنَ ﴿۱۱۴﴾

دن کے دونوں سروں میں نماز برپا رکھ اور رات کی کئی ساعتوں میں بھی، [2] یقیناً نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں۔ [3] یہ نصیحت ہے نصیحت پکڑنے والوں کے لئے۔ (۱۱۴)

وَاصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۱۵﴾

آپ صبر کرتے رہیے یقیناً اللہ تعالیٰ نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔ (۱۱۵)

---

(۱) اس کا مطلب ہے کہ ظالموں کے ساتھ نرمی اور مداہنت کرتے ہوئے ان سے مدد حاصل مت کرو۔ اس سے ان کو یہ تأثر ملے گا کہ گویا تم ان کی دوسری باتوں کو بھی پسند کرتے ہو۔ اس طرح یہ تمہارا ایک بڑا جرم بن جائے گا جو تمہیں بھی ان کے ساتھ، نار جہنم کا مستحق بنا سکتا ہے۔ اس سے ظالم حکمرانوں کے ساتھ ربط و تعلق کی بھی ممانعت نکلتی ہے۔ الا یہ کہ مصلحت عامہ یا دینی منافع متقاضی ہوں۔ ایسی صورت میں دل سے نفرت رکھتے ہوئے ان سے ربط و تعلق کی اجازت ہو گی۔ جیسا کہ بعض احادیث سے واضح ہے۔

(۲) "دونوں سروں" سے مراد بعض نے صبح اور مغرب، بعض نے صرف عشاء اور بعض نے عشاء اور مغرب دونوں کا وقت مراد لیا ہے۔ امام ابن کثیر فرماتے ہیں کہ ممکن ہے کہ یہ آیت معراج سے قبل نازل ہوئی ہو، جس میں پانچ نمازیں فرض کی گئیں۔ کیونکہ اس سے قبل صرف دو ہی نمازیں ضروری تھیں، ایک طلوع شمس سے قبل اور ایک غروب سے قبل اور رات کے پچھلے پہر میں نماز تہجد۔ پھر نماز تہجد امت سے معاف کر دی گئی، پھر اس کا وجوب بقول بعض آپ ﷺ سے بھی ساقط کر دیا گیا۔ (ابن کثیر) وَاللّٰهُ أَعْلَمُ.

(۳) جس طرح کہ احادیث میں بھی اسے صراحت کے ساتھ بیان فرمایا گیا ہے۔ مثلاً پانچ نمازیں، جمعہ دوسرے جمعہ تک اور رمضان دوسرے رمضان تک، ان کے مابین ہونے والے گناہوں کو دور کرنے والے ہیں بشرطیکہ کبیرہ گناہوں سے اجتناب کیا جائے" (صحیح مسلم۔ کتاب الطہارۃ۔ باب الصلوات الخمس والجمعۃ إلی الجمعۃ ......) ایک اور حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" "بتلاؤ! اگر تم میں سے کسی کے دروازے پر بڑی نہر ہو، وہ روزانہ اس میں پانچ مرتبہ نہاتا ہو، کیا اس کے بعد اس کے جسم پر میل کچیل باقی رہے گا؟ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا "نہیں" آپ ﷺ نے فرمایا "اسی طرح پانچ نمازیں ہیں، ان کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ گناہوں اور خطاؤں کو مٹا دیتا ہے" بخاری۔ کتاب المواقیت، باب الصلوات الخمس کفارۃ ومسلم کتاب المساجد، باب المشی إلی الصلوٰۃ تمحی بہ الخطایا وترفع بہ الدرجات)

فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ اُولُوْا بَقِيَّةٍ يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْاَرْضِ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّنْ اَنْجَيْنَا مِنْهُمْ ۚ وَاتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَآ اُتْرِفُوْا فِيْهِ وَكَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ﴿۱۱۶﴾

پس کیوں نہ تم سے پہلے زمانے کے لوگوں میں سے ایسے اہل خیر لوگ ہوئے جو زمین میں فساد پھیلانے سے روکتے، سوائے ان چند کے جنہیں ہم نے ان میں سے نجات دی تھی،[1] ظالم لوگ تو اس چیز کے پیچھے پڑ گئے جس میں انہیں آسودگی دی گئی تھی اور وہ گنہگار تھے۔[2] (۱۱۶)

وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ ﴿۱۱۷﴾

آپ کا رب ایسا نہیں کہ کسی بستی کو ظلم سے ہلاک کر دے اور وہاں کے لوگ نیکوکار ہوں۔(۱۱۷)

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ ﴿۱۱۸﴾

اگر آپ کا پروردگار چاہتا تو سب لوگوں کو ایک ہی راہ پر ایک گروہ کر دیتا۔ وہ تو برابر اختلاف کرنے والے ہی رہیں گے۔(۱۱۸)

اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ ۭ وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ ۭ وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۱۹﴾

بجز ان کے جن پر آپ کا رب رحم فرمائے، انہیں تو اسی لیے پیدا کیا ہے،[3] اور آپ کے رب کی یہ بات پوری ہے کہ میں جہنم کو جنوں اور انسانوں سب سے پر کروں گا۔[4] (۱۱۹)

---

(۱) یعنی گزشتہ امتوں میں سے ایسے نیک لوگ کیوں نہ ہوئے جو اہل شر اور اہل منکر کو شر، منکرات اور فساد سے روکتے؟ پھر فرمایا، ایسے لوگ تھے تو سہی، لیکن بہت تھوڑے۔ جنہیں ہم نے اس وقت نجات دے دی، جب دوسروں کو عذاب کے ذریعے سے ہلاک کیا گیا۔

(۲) یعنی یہ ظالم، اپنے ظلم پر قائم اور اپنی مدہوشیوں میں مست رہے حتیٰ کہ عذاب نے انہیں آلیا۔

(۳) "اسی لیے" کا مطلب بعض نے اختلاف اور بعض نے رحمت لیا ہے۔ دونوں صورتوں میں مفہوم یہ ہوگا کہ ہم نے انسانوں کو آزمائش کے لیے پیدا کیا ہے۔ جو دین حق سے اختلاف کا راستہ اختیار کرے گا، وہ آزمائش میں ناکام اور جو اسے اپنا لے گا، وہ کامیاب اور رحمت الٰہی کا مستحق ہوگا۔

(۴) یعنی اللہ کی تقدیر اور قضاء میں یہ بات ثبت ہے کہ کچھ لوگ ایسے ہوں گے جو جنت کے اور کچھ ایسے ہوں گے جو جہنم کے مستحق ہوں گے اور جنت و جہنم کو انسانوں اور جنوں سے بھر دیا جائے گا۔ جیسا کہ حدیث میں ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جنت اور دوزخ آپس میں جھگڑ پڑیں، جنت نے کہا، کیا بات ہے کہ میرے اندر وہی لوگ آئیں گے جو کمزور اور معاشرے کے گرے پڑے لوگ ہوں گے؟" جہنم نے کہا "میرے اندر تو بڑے بڑے جبار اور متکبر قسم کے لوگ ہوں گے"۔ اللہ تعالیٰ نے جنت سے فرمایا "تو میری رحمت کی مظہر ہے، تیرے ذریعے سے میں جس پر چاہوں اپنا رحم کروں۔ اور جہنم سے اللہ تعالیٰ

وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ ۚ وَجَآءَكَ فِيْ هٰذِهِ الْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ وَّذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۲۰﴾

رسولوں کے سب احوال ہم آپ کے سامنے آپ کے دل کی تسکین کے لیے بیان فرما رہے ہیں- آپ کے پاس اس سورت میں بھی حق پہنچ چکا جو نصیحت و وعظ ہے مومنوں کے لیے-(۱۲۰)

وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ ؕ اِنَّا عٰمِلُوْنَ ﴿۱۲۱﴾

ایمان نہ لانے والوں سے کہہ دیجئے کہ تم اپنے طور پر عمل کیے جاؤ ہم بھی عمل میں مشغول ہیں-(۱۲۱)

وَانْتَظِرُوْا ۚ اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ﴿۱۲۲﴾

اور تم بھی انتظار کرو ہم بھی منتظر ہیں-[1] (۱۲۲)

وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاِلَيْهِ يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ ؕ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۳﴾

زمینوں اور آسمانوں کا علم غیب اللہ تعالیٰ ہی کو ہے' تمام معاملات کا رجوع بھی اسی کی جانب ہے' پس تجھے اسی کی عبادت کرنی چاہیے اور اسی پر بھروسہ رکھنا چاہیے اور تم جو کچھ کرتے ہو اس سے اللہ تعالیٰ بے خبر نہیں-(۱۲۳)

سُوْرَةُ يُوْسُفَ

سورۂ یوسف مکی ہے اور اس میں ایک سو گیارہ آیتیں اور بارہ رکوع ہیں-

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے-

الٓرٰ ۚ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ﴿۱﴾

الر' یہ روشن کتاب کی آیتیں ہیں-(۱)

نے فرمایا تو میرے عذاب کی مظہر ہے تیرے ذریعے سے میں جس کو چاہوں سزا دوں- اللہ تعالیٰ جنت اور دوزخ دونوں کو بھر دے گا- جنت میں ہمیشہ اس کا فضل ہو گا' حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ ایسی مخلوق پیدا فرمائے گا جو جنت کے باقی ماندہ رقبے میں رہے گی- اور جہنم' جہنمیوں کی کثرت کے باوجود ﴿ هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ ﴾ کا نعرہ بلند کرے گی' یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس میں اپنا قدم رکھے گا جس پر جہنم پکار اٹھے گی- قَطْ قَطْ ، وَعِزَّتِكَ "بس' بس' تیری عزت و جلال کی قسم" (صحيح بخاری- كتاب التوحيد' باب ما جاء فی قوله تعالیٰ إن رحمة الله قريب من المحسنين' وتفسير سورة ق- مسلم' كتاب الجنة' باب النار يدخلها الجبارون والجنة يدخلها الضعفاء)

(۱) یعنی عنقریب تمہیں پتہ چل جائے گا کہ حسن انجام کس کے حصے میں آتا ہے اور یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ ظالم لوگ کامیاب نہیں ہوں گے- چنانچہ یہ وعدہ جلد ہی پورا ہوا اور اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو غلبہ عطا فرمایا اور پورا جزیرۂ عرب اسلام کے زیر نگین آگیا-